ہم کہ ٹھہرے اعلیٰ کردار

سعدیہ عابد

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پت جھڑ کے موسم میں تجھ کو
کون سے پھول کا تحفہ بھیجوں
میرا آنگن خالی ہے
لیکن میری آنکھوں میں
نیک دعاؤں کی شبنم ہے
شبنم کا ہر تارا
تیرا آنچل تھام کے کہتا ہے
خوشبو، گیت، ہوا، پانی اور رنگ کو
چاہنے والی لڑکی
جلدی سے اچھی ہو جا
صبح بہار کی آنکھیں کب سے
تیری نرم ہستی کا رستہ دیکھ رہی ہیں

شاہ تاج بخار میں بری طرح تپ رہی تھی، وہ نیم غنودگی کی حالت میں تھی جب کمرے کا دروازہ کھلا تھا، وہ دگرگوں حالت کے باوجود جانی پہچانی مخصوص مہک کو پہچاننے کا مرحلہ با آسانی طے کر گئی تھی اور لاشعوری طور پر اس کی ہر اک بے اعتنائی کے باوجود اس کی پیش رفت کی منتظر تھی، مگر جب مخصوص کلون کی خوشبو محسوس ہونا بند ہوئی تو انتظار لا حاصل بنا اس کا منہ چڑاتا اس کی آنکھیں بھگو گیا۔

''حمزہ سکندر! کب تم مجھے میرے نا کردہ جرم کی سزا سے آزاد کرو گے کب؟'' وہ کرلائی تھی اور نیم بے ہوشی، بے ہوشی میں منتقل ہو گئی تھی، حویلی میں شادیانے گونج رہے تھے اور ایسے میں کولہو کے بیل کی مانند صبح سے رات تک کام کرنے والی شاہ تاج کی کسی کو نہ ضرورت پڑی نہ کمی محسوس ہوئی کہ اس سے سال کے بارہ ماہ میں صرف ان دنوں بیگار نہیں لی جاتی تھی، جب حویلی میں کوئی جشن ہوتا تھا کیونکہ وہ حویلی کے مکینوں کے نزدیک منحوس تھی اور جس کا سایہ بھی وہ اپنی خوشیوں پر نہیں ڈال سکتے، خوشیاں مناتے وہ اس

مکمل ناول

سے بے خبر تھے کہ شاہ تاج کام کی اتنی عادی ہوگئی تھی کہ آرام اسے بیمار کر گیا تھا، حویلی میں واحد ایک اس کی محسن اس کی غمگسار زینب اس کے لئے حویلی کی ملکانی سے نظر بچا کے کھانا لائی تھی تو اس کو بے ہوش بخار میں جلتے دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی تھی، ہوش میں لانے کی تدبیر بیکار گئی تھی تو وہ پریشانی سے کمرے سے نکلی تھی کہ عجلت میں بری طرح اس سے ٹکرا گئی جس کی تیوری کے بل نمایاں ہو گئے تھے۔

"اندھی ہوگئی ہو جاہل لڑکی۔" اس کی دھاڑ پر اس کا خوف دوچند ہوگیا تھا، وہ منمناتے ہوئے معافی طلب کرنے لگی تھی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آگے پیچھے دیکھ کر چلا کرو ورنہ تمہاری بٹن جیسی آنکھوں کو ناکارہ بنا دوں گا۔" وہ لرزتی ہوئی زینب کو دیکھتے ہوئے خونخوار لہجے میں گرجا تھا اور کمرے میں گھس گیا اور اسے چار گھنٹوں پہلے والی حالت میں دیکھ اس کا غصہ سوا ہو گیا تھا۔

"شاہ تاج!" گرج کر پکارا تھا اور اس کی مدھم آواز پر بھی لرزا ٹھنے والی لبیک کہہ کر بوتل کے جن کی طرح نازل ہو جانے والی زوردار گرج پر بھی ہلی تک نہیں تو اس کو اپنے اندر شرارے سے اٹھتے ہوئے محسوس ہوئے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ زور سے حلق کے بل چلایا تھا مگر یہ چلانا بھی بے سود ثابت ہوا تو وہ چیل کی مانند اس پر جھپٹا بازو سے پکڑ کر اسے کھڑا کر دینا چاہا تھا مگر وہ ہوش میں ہوتی اور محض سو رہی ہوتی تو شاید وہ ایسا کر پاتا، وہ تو کٹی ہوئی شاخ کی مانند اسی پر آ رہی تھی، وہ بائیں ہاتھ کی مدد سے دیوار کا سہارا نہ لے لیتا تو ضرور گرتا مگر فی الحال لڑکھڑا جانے تک ہی اکتفا ہوا تھا اور اس نے سنبھل کر اسے واپس بیڈ پر دھکیلا تھا جو آدھی بیڈ پر تھی اور آدھی اس پر آ رہی تھی اور وہ ڈاکٹر ہونے کے ناطے سمجھ چکا تھا کہ وہ بخار کی شدت سے بے ہوش تھے اور اس نے ماتھا چھوا تو لگا جیسے انگارہ چھو لیا ہو اور اب وہ اس کی نبض چیک کر رہا تھا، وہ اس کے ساتھ بہت اہم پاکیزہ رشتہ ہونے کے باوجود اسے بہت نزدیک سے پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا، علاج کی نیت سے ہی سہی اسے چھو رہا تھا اور اس وقت وہ ایک بارعب جنگلی سا جاگیر دار نہیں عام سا ایک ڈاکٹر لگ رہا تھا، وہ اپنی دشمن کا نہیں جیسے بس ایک عام عورت کا علاج کر رہا تھا جبکہ وہ اپنے اسے پیشے کو کئی سال پہلے ہی خیر باد کہہ چکا تھا، گرد آلود بوکس سے اس نے اسٹیتھسکوپ نکالا اور وہ بھرپور توجہ سے بے سدھ پڑی شاہ تاج کو چیک کرنے لگا، اس کی ہتھیلیاں اور تلوے باری باری سہلائے، اگر وہ ہوش میں ہوتی تو اس کی اتنی کرم نوازی پہ بے ہوش ہو جاتی، جس کی ایک نرم نگاہ کے لئے وہ پچھلے تین سالوں سے ترس رہی تھی اور وہ جو پہلے عجلت میں محسوس نہیں کر سکا تھا کہ وہ اس کے بستر پر لیٹی ہے آتے ہی غصہ میں دھاڑا ہی اس لئے تھا کہ اس سے اتنی جرأت کی امید نہ تھی، لیکن اب نہ صرف اس کا سر تکیہ پر درست کیا بلکہ اسے اپنا دبیز مخملی کمبل اوڑھایا کہ اسے بخار سردی کی شدت سے ہوا تھا اسے حرارت کی ضرورت تھی، اس کی توجہ اور ٹریٹمنٹ کا ہی اثر تھا کہ گھنٹے بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں، مگر ذہن بیدار نہ ہوا تھا آہٹ پر اس نے گردن موڑی تھی اور اسے تولیے سے منہ صاف کرتے واش روم سے نکلتے دیکھ وہ جتنی تیزی و برق رفتاری سے کمبل ہٹا کر اٹھ سکتی تھی، اٹھی تھی مگر بخار محض کم ہوا تھا، نقاہت ابھی باقی تھی اور اس نے عجلت بھی خوب دکھائی تھی اس لئے منہ کے بل نیچے کارپٹ پر گری تھی اور اٹھنے میں اتنی دیر تو لگائی تھی کہ وہ سہولت سے

تولیہ اسٹینڈ پر ڈالتا اس کے عین سامنے آرکا تھا اور وہ اس کے بے پناہ خوبصورت گورے چٹے پاؤں دیکھتی سائیڈ ٹیبل کے سہارے کھڑی ہوتی تھی، کچھ دیر قبل کی نرمی و توجہ وہ جیسے پانی میں بہا آیا تھا اور اب تیکھے چتونوں سے اسے گھور رہا تھا جو اس کے ممکنہ غصہ و جلال کے خوف سے لرز رہی تھی اور اسے اپنے دوپٹے تک کا ہوش نہیں تھا، وہ تین سالوں میں پہلی دفعہ بنا چادر کی بکل مارے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی میرے بستر کو استعمال کرنے کی؟'' اس کی دھاڑ پر تو اس سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل لگنے لگا تھا کہ وہ کچھ کہہ پاتی کہ وہ اوروں کے مقابلے میں اس کے سامنے تو ایک لفظ بھی نہیں کہہ پاتی تھی وہ اس کے غصے و جلال کے وقت کچھ کہہ دیتی۔

''کچھ پوچھا ہے میں نے۔'' اس کی خاموشی خوف محسوس کرتے ہوئے بھی بری طرح کھلی تھی۔

''وہ...... مم...... میری...... طب...... طبیعت...... ٹھیک...... نہیں...... تھی، مجھے پتہ ہی نہیں...... چل...... چلا...... کہ میں...... آ...... آپ...... کے...... بیڈ پر...... کب...... کیسے...... سو گئی۔'' وہ گرنے سے بچنے کو سائیڈ ٹیبل سے نہ صرف ٹیک لگا گئی تھی بلکہ اسے تھامے ہوئے بھی تھی۔

''او ہو تو سونا تمہیں اتنا پسند ہے کہ تمہیں سوتے وقت کچھ ہوش ہی نہیں رہتا کہ تم کس کے بستر پر سو گئی ہو۔'' وہ لہجے میں اس پر الزام جڑ گیا تھا اور اس نے بہت تڑپ کر اسے دیکھا کہ ہر طرح کی تذلیل برداشت کرنے کے بعد بھی یہ کب سوچا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب وہ اس کے کردار کے پرخچے اڑائے گا۔

''آ...... آپ...... ایسی...... ایسا...... سو...... سوچ...... بھی...... کیس...... کیسے...... سکتے ہیں۔'' اس کے سوکھے پپڑی زدہ لب اپنے دفاع میں کچھ کہہ ہی نہیں پائے تھے۔

''تم نے ہی مجبور کیا ہے، بیمار تھیں تم اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ کہاں گر پڑ رہی ہو، کہاں کس کے ساتھ اپنا منہ کالا کر رہی ہو۔'' اس کی منمناہٹ پر وہ اور شیر ہوا تھا۔

''جان سے مار دیں مجھے، لیکن اتنا گھٹیا الزام نہ لگائیں، میں ایسی نہیں ہوں، آپ نے بھلے مجھے کچھ نہ سمجھا ہو، کچھ نہ دیا ہو تحقیر و تذلیل کے سوا، مگر اس کمرے کی ایک ایک چیز پر اس بستر کے میں حق رکھتی ہوں۔'' وہ شروع کے چند دنوں کے بعد سے اب کئی سال بعد اس کے سامنے بنا لڑکھڑائے کچھ بولی تھی۔

''ہا...... حق...... جو حق تم چاہتی ہو نہ وہ تو تمہیں اس زندگی میں ملنے سے رہا اور تمہارا خاندان کتنا پارسا ہے جانتا ہوں اور تم کتنی پارسا ہو یہ خوبی اندازہ ہے مجھے، مگر تمہارا وجود برداشت کر رہا ہوں نہ تو یہ تمہارے خاندان سے زیادہ خود کو اپنے خاندان کو اذیت دے رہا ہوں، میرے صبر کو مت آزمایا کرو کہیں میں خود اذیتی کی دیواریں توڑ کر ظلم کی دیواریں نہ تعمیر کر دوں۔'' وہ اپنی خوبصورت آنکھوں میں نفرت و غصہ کی سرخی لئے اسے گھور رہا تھا جو ششدر کھڑی تھی، وہ یہ تک نہ پوچھ سکی کہ اگر اس نے ظلم کیا ہی نہیں ارادہ رکھتا ہے تو تین سالوں سے کیوں اسے مشق ستم بنایا ہوا ہے؟ وہ جو کرتا رہا ہے وہ بھی ظلم کے نہیں تو پھر آخر آتا کس زمرے میں ہے؟ وہ یہ سب سوچ ہی سکی کہنے کی جرأت نہ کر سکی کہ اس کی ایک نفرت میں ڈوبی تیز نظر اس کا سارا اعتماد سلب کر لیتی تھی۔

"میرے سامنے سے اپنا منحوس وجود ہٹا لو اور ہاں لمحہ ضائع کیے بنا میرے بستر کی چادر تبدیل کرو اور کمبل اٹھا لو، دونوں چیزیں تم اپنے استعمال میں لا سکتی ہو مگر اب میری نگاہ و استعمال سے یہ دونوں چیزیں دور ہو جانی چاہییں۔" وہ نخوت و حقارت سے کہتا اس کے جلتے جسم و جان و روح کو گویا شعلہ دکھایا تھا۔

"حمزہ سکندر! مجھے کوئی چھوت کی بیماری نہیں ہے جو آپ اس طرح سے کہہ رہے ہیں اور میرے لیٹنے سے اگر آپ کا بستر ناپاک ہو جاتا ہے تو یہ مت بھولیے کہ اس بچھانے والی بھی میں ہی ہوں، اس چادر ہی نہیں اس حویلی کے در و دیوار پر میری مشقت کی داستان لکھی ہے، آپ جو کھانا کھاتے ہیں وہ میں اپنے ناپاک ہاتھوں سے ہی بناتی ہوں، میرے ناپاک ہاتھ ہی آپ کے لباس کا میل کچیل نکالتے ہیں تو ہی آپ دنیا کے سامنے پاک صاف ہو کر جاتے ہیں، میرا وجود ناپاک ہے تو اس نے تو آپ کے خاندان کو معہ سمیت آپ کے گندہ کر دیا ہے، مگر کتنے اچنبھے کی بات ہے میں ہی گندہ کرتی ہوں اور میں ہی صاف۔" آج جیسے اس کی صبر کی حد ٹوٹ گئی تھی مگر وہ تلخ حقیقت برداشت نہ کر سکا، گھما کر ایک تھپڑ اس کے نرم رخسار پر جڑ گیا، سہارے کی وجہ سے گری تو نہیں مگر چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

"لائیے، حمزہ سکندر، آپ کا ہاتھ نکال کر اپنے استعمال میں لے آؤں اور کم از کم آپ کی نگاہ سے تو دور کر ہی دوں کہ میرے لیٹنے سے آپ کا بستر ناپاک ہو جاتا ہے تو مجھے چانٹا مارنے سے ہاتھ ناپاک ہو گیا ہوگا کہ مجھے میرے حق سے اسی لئے تو محروم کیے ہوئے ہیں نہ کہ آپ کا وجود ناپاک ہو جائے گا، آپ کا وجود تو نہیں ہاتھ ضرور ناپاک ہو گیا ہے، اس حویلی کی ہر گندگی صاف کرنے کی ذمہ داری ہے مجھ پر لائیے اس گندگی کو بھی صاف کر دوں، ورنہ آپ مجھ پر غصہ ہوں گے چھوٹے مالک۔" وہ گہرے طنز سے چبا چبا کر کہتی تین سالوں سے چلتی قینچی کی مانند زبان کو زنگ لگ گئی تھی، اس نے تین سال جو وار کیے تھے وہ ان کا حساب ایک لمحے میں چند لفظوں سے کر گئی تھی کہ اس نے آج آئینہ سامنے رکھ دیا تھا اور اس کی مکروہ شکل جس میں صاف نظر آنے لگی تھی، وہ اسے جوتے کی نوک پہ رکھتا آیا تھا اور وہی نوک آج خود اس کو چبھنے لگی تھی کہ وہ حویلی کی مالکن تھی مگر اسے نوکرانی بنا کر رکھا، اس کو اس کے حقوق سے محروم رکھا اور وہ اسی قابل لگی تھی کہ اسے اپنے ناپاک ہو جانے کا خدشہ تھا یا نہیں ظاہر یہی کیا تھا اور پاک چیز کو ناپاک کرنے کے لئے سمندر نہیں محض ایک قطرہ بھی کافی ہوتا ہے اور وہ اس کے وجود سے یہ کیسا دور رہا تھا کہ اس کے کمرے کی ایک ایک چیز، اس کی حویلی کی ایک ایک چیز اس کے سلیقے کا ثبوت تھی، ایک ایک چیز میں اس کے ہاتھوں کی مہک تھی اور جب اس کا وجود ناپاک تھا، تو ہاتھ پاک کیسے ہو سکتے تھے؟ اور سانسیں اس نے تین سالوں کے کئی گھنٹوں میں کئی سانسیں لی ہوں گی اور جب وہ ناپاک تھی تو اس کی سانسیں بھی تو ناپاک ہوئیں اور وہ اس حویلی میں سانسیں لیتی رہی تھی تو حویلی کو اس کے مکینوں کو تو اس نے ناپاک کر دیا اور وہ ناپاکی کے ڈر سے اس کے قریب نہیں جاتا تو اپنے قریب کیسے رہ لیتا ہے؟ اسکول و کالج میں شعلہ جواں مقرر مشہور حمزہ سکندر کی بولتی بند ہو گئی تھی اور وہ جواس کے سامنے ٹھہر نہیں پاتی تھی اور وہ جم کر میدان میں صحیح سے اتری بھی نہ تھی کہ وہ پہلے ہی وار پہ چت ہوتا وہاں سے نکل گیا کہ اب نہ ٹھہر سکنے کی باری اس کی تھی کہ مظلوم کی آواز بلند ہوئی اور حاکم

کا زوال شروع۔

لوگوں نے کہا، اس در سے کبھی
کوئی ناامید نہیں لوٹا
کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا
میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا
چہرے پر گرد ملال لئے
اک پرامید خیال لئے
اک خالی دست سوال لئے
جب قافلہ اس در پر پہنچا
میں اس گھر کو پہچان گیا
پھر خالی ہاتھ ہی لوٹ آیا
اس در سے مجھے کیا ملنا تھا
وہ گھر تو میرا ہی اپنا ہے

☆☆☆

''شمی، موڈ کیوں آف ہے تمہارا؟'' اسے خلاف معمول و عادت پورے پچیس منٹ خاموش بیٹھے دیکھ بالآخر وہ اپنا اہم کام چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی اور اس نے کھا جانے والی نگاہوں سے عطیہ کو دیکھا تھا۔

''بڑی جلدی خیال آ گیا۔'' وہ یوں بولی تھی جیسے وہ منہ بنا کر بیٹھی ہی اس لئے تھی تاکہ وہ اس سے وجہ پوچھ سکے۔

''اماں! مجھے ٹرپ پر نہیں جانے دے رہیں اور تو اور ابا بھی اماں کے ہمنوا بنے ہوئے ہیں۔'' وہ اس کے ایکسکیوز کرتے ہی نان اسٹاپ شروع ہو گئی تھی۔

''ابا، اماں کے ہمنوا بنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے اماں کے ہمنوا ہیں، اماں کی کسی بات سے ابا انکار کرتے ہی کب ہیں۔'' وہ شوخی و برجستگی سے بولی تھی اور وہ اس حقیقت سے انکار نہ کر پاتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

''تمہارا کالج ٹرپ پر جا کب رہا ہے؟'' دریافت کیا تھا۔

''نیکسٹ ویک، ابا سے تو میں اجازت لے لوں گی، اماں کو بھی وہ خود ہی راضی کر لیں گے۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولی تھی۔

''جب سب کچھ کرنے کا ارادہ ہے اور ہو جانے کا یقین بھی ہے تو یہ منحوس صورت بنا کر سڑی ہوئی اداکاری کا مقصد کیا تھا؟'' وہ جو کتابیں سمیٹ رہی تھی ہاتھ روک کر اس پر بگڑی تھی جو کل کل کرتی ہنسی ہنسنے لگی تھی۔

''میرے ایگزامز ہو گئے ہیں، میں آج کل فارغ ہوں تم مجھے وقت ہی نہیں دیتی ہو نہ بس اس لئے۔'' ہنسی روکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

''خدا کو مانو یار، جانتی ہو نہ آج کل میں تھیسس کی تیاری میں مصروف ہوں، تھیسس سبمٹ کروانے میں دو ماہ ہی تو باقی ہیں اور مجھو ابھی تو جیسے کچھ بھی کیا ہی نہیں ہے میں نے، ریسرچ ورک بھی کتنا باقی ہے۔'' وہ یکدم ہی پریشان ہو گئی تھی۔

''توبہ کرو صبح سے رات تک اسی میں لگی رہتی ہو، کبھی کاغذوں سے چمٹی ہوتی ہو تو کبھی لیپ ٹاپ کے ساتھ اور کہیں جانے کی تو تم بات بھی نہ کرنا، اپنے تھیسس کا میٹریل جمع کرنے کے لئے تو تم لور لور پھرتی رہتی ہو مگر مجال ہے کبھی شاپنگ و پکنک پر بھی جانے کا جو نام بھی لو، رات میری ذیشان بھائی سے بات ہوئی تھی شکوہ کر رہے تھے کہ نہ تم ان کی کال ریسیو کر رہی ہو نہ ہی فیس بک پہ تم انہیں دستیاب ہو رہی ہو، جب تم ہمیں ہمارے ساتھ وجود ہونے کے باوجود غیر دستیاب رہتی ہو تو انہیں سات سمندر پار برقی آلات کے ذریعے کہاں دستیاب ہو سکتی ہو۔'' وہ شروع ہوئی تو چپ ہونا مشکل ہو گیا تھا۔

"مجھے اندازہ ہے شبی، کہ میں تم لوگوں کو وقت نہیں دے پا رہی اور ذیشان کی کال تو میں جان کر ریسیو نہیں کر رہی کہ وہ گھنٹہ سے کم تو بھی بات ہی نہیں کرتے اور آج کل تو مجھ پر اک اک لمحہ بھاری ہے، میرے پاس وقت کم ہے جو باتوں میں، میں ضائع نہیں کرنا چاہتی۔" وہ بکھرے کاغذ سمیٹ رہی تھی اس نے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔

"اور اگر جو ذیشان بھائی تم سے ناراض ہو گئے؟" چڑ کر پوچھا تھا۔

"اوّل تو وہ مجھ سے ناراض نہیں ہوتے بالفرض ہو گئے تو منا لوں گی۔" اس کے انداز میں لاپرواہی اور ذیشان کا دیا ہوا یقین بول رہا تھا۔

"تمہیں نہ ذیشان بھائی نے سر پر چڑھایا ہوا ہے۔"

"ہاں، لیکن تم بہت میرا وقت ضائع کر چکیں، اب جاؤ اور موڈ بنے تو ایک کپ اسٹرانگ سی چائے بنا دینا۔" اس کی بات کی نفی کرنے کی بجائے ایک لفظی اقرار کیا تھا اور اسے جانے کا کہنے کے ساتھ اس کی مرضی پر چھوڑتے ہوئے کام بھی سونپا تھا اور وہ بھی بلا حیل و حجت کے اس کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

مسرور درانی ایک پرائیویٹ بینک میں اکاؤنٹنٹ تھے، ان کی دو بیٹیاں تھیں، عطیہ درانی اور شاہ تاج درانی، عطیہ، کا نکاح اکلوتے پھپھی زاد سے دو سال قبل ہو گیا تھا جب وہ بیٹے کے ساتھ انگلینڈ سے آئی تھیں، رخصتی اس لئے نہ ہوتی تھی کہ ذیشان اسٹیبل ہونا چاہتا تھا اور اس کا ارادہ پاکستان شفٹ ہونے کا تھا اور وہ تمام انتظام کر چکا تھا اسی لئے وہ لوگ بہت جلد پاکستان شفٹ ہونے والے تھے، عطیہ جنرل ازم میں ایم ایس کر رہی تھی، جبکہ شاہ تاج نے انٹر کے ایگزامز دیئے تھے، رزلٹ آنے کے بعد اس کا آئی بی اے میں داخلہ لینے کا مصمم ارادہ تھا، شاہ تاج نے ٹور پر جانے کی بے حد ضد کی، روئی دھوئی، کھانا چھوڑا، کمرہ بند ہوئی مگر سب بے سود رضیہ بیگم نے اسے اجازت نہ دینی تھی نہ دی وہ مسرور درانی سے بہت لڑی ناراض ہوئی مگر وہ بھی نہ مانے کہ وہ بیوی کی فکر و پریشانی کو سمجھتے تھے اور وہ ان لوگوں کی بات ماننے پر مجبور تو ہو گئی، مگر جب فیچر لکھنے اور تھیسس مکمل کرنے کے لئے اسے گاؤں جانا پڑا کہ وہ اپنے فیچر کو حقیقی رنگ دینے کے لئے دیہاتی زندگی کو نزدیک سے دیکھنا چاہتی تھی تو شاہ تاج بھی جانے کے لئے بضد ہو گئی اور وہ دونوں میاں بیوی تو چپ سے رہ گئے، مگر رضیہ بیگم نے بھی صاف جانے سے منع کر دی۔

"یہ غلط ہے اماں! جب عطیہ کو ہر جگہ جانے کی اجازت دے سکتی ہیں آپ تو مجھے کیوں نہیں؟" اس نے روتے ہوئے پرزور احتجاج کیا تھا۔

"تم ابھی چھوٹی ہو بیٹا، اکیلے بھیجتے مجھے خوف آتا ہے کہ عطیہ پھر بھی سمجھدار ہے اور تم۔"

"اماں! آپ نے عطیہ کو کبھی اکیلے کہیں جانے سے نہیں روکا، ساری پابندیاں میرے ہی لئے ہیں اور اب تو میں اکیلے نہیں جا رہی آپ کی سمجھدار عطیہ کے ساتھ ہی تو جاؤں گی اور جب وہاں عطیہ جا سکتی ہے تو میں کیوں نہیں؟" وہ ماں کی بات کے درمیان میں سوں سوں کرتی شکوہ کناں لہجے میں بول رہی تھی۔

"اس لئے کہ میں تمہیں وہاں کیا کہیں بھی کبھی بھی نہیں بھیجنا چاہتی اور جب میں نے انکار کر دیا تو اب تم جانے کا نام بھی نہیں لو گی۔" وہ بے بسی کو غصہ کی چادر عطا کرتیں اٹھ گئی تھیں۔

''اور میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ میں وہاں ضرور ہی جاؤں گی، وگرنہ عطیہ بھی نہیں جائے گی۔'' وہ بے لچک لہجے میں کہتی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی جبکہ وہ اپنی جگہ پر جم سی گئی تھیں، کانوں میں ایک بے لچک بے رحم لہجہ گونج اٹھا تھا، عطیہ ماں کا زرد چہرہ دیکھ کر لپک کر ان تک آئی تھی اور وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھیں اور اس کے تو ہاتھ پاؤں بھی پھول گئے تھے۔

☆☆☆

''رضیہ! کیوں پریشان ہوتی ہو، کچھ نہیں ہو گا، جانے دو اسے۔''

''نہیں، مسرور کبھی نہیں، اسے پتہ بھی چل گیا نہ تو وہ مجھ سے میری شہی، چھین لے گا، میں نے بہت کچھ کھویا ہے زندگی میں، اعتبار، بھائی بہن، والدین، لیکن اب بیٹی کھونے کا مجھ میں بالکل حوصلہ نہیں ہے، آپ کی وہ بات مان لے گی، آپ اسے سمجھائیں وہ ضد چھوڑ دے، اس کے خوف سے میں نے شہی کو کبھی اکیلے گھر سے نکلنے نہیں دیا، کہیں آنے جانے نہیں دیا تو اب اسے گاؤں کیسے بھیج دوں؟ وہ وہیں ہوا تو؟ اس نے شہی کو دیکھ لیا تو؟ وہ اسے پہچان لے گا اور مجھ سے شہی کو چھین لے گا۔''

''کیا تم اس شخص کے گاؤں اور اس کے نام تک کو نہیں جانتیں؟'' کچھ سوچ کر پوچھا تھا۔

''نہیں وہ شخص میرے لئے اتنا اہم نہیں تھا، میں نے نہ اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی نہ اس نے مجھے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔'' وہ بچوں کی طرح خوفزدہ سی مسرور درانی سے لپٹ گئی تھیں۔

''رضیہ! سنبھالو خود کو، میں شہی کو سمجھاؤں گا وہ میری بات مان لے گی۔'' انہوں نے بیوی کو تسلی دی تھی، مگر وہ بھی جیسے اڑ گئی تھی اس کی ایک ہی ضد تھی کہ جب عطیہ جا سکتی ہے تو وہ کیوں نہیں اور یہی سوال لے کر عطیہ ماں باپ کے پاس چلی آئی تھی اور وہ حقیقت جو وہ سب سے چھپا کر ہی رکھنا چاہتی تھیں وہی حقیقت مسرور درانی نے بیٹی کو بتا دی تھی اور وہ تو جیسے خود کو خلا میں ہی محسوس کرنے لگی تھی اور رضیہ بیگم کے چہرے کو بے یقینی سے دیکھنے لگی تھی۔

''اماں! آپ کہہ دیں جو ابا نے کہا وہ سب جھوٹ ہے، آپ ہی میری اماں ہیں۔'' وہ رضیہ بیگم کے ہاتھ تھامے سسک اٹھی تھی۔

''ہاں ماں ہوں میں تمہاری، صرف پیدا کرنے والی ہی تو ماں نہیں ہوتی نا، پالنے، پرورش کرنے والی بھی ماں ہوتی ہے اور تم میری بیٹی ہو، کبھی یہ مت کہنا، نہ سمجھنا کہ میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔'' انہوں نے عطیہ کو بانہوں میں بھر لیا تھا۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا عطیہ کو سچائی بتا کر اور سچائی بتانی تھی تو صرف شہی کو بتا دیتے، عطیہ کو یہ کیوں بتا دیا کہ میں نے اسے جنم نہیں دیا۔'' وہ شوہر سے شکوہ کناں ہوئی تھیں۔

''یہ سب ضروری تھا، جب تک نہیں بتایا تھا نہیں بتایا تھا اب آدھی ادھوری جھوٹ میں لپیٹ کر سچائی نہیں بتا سکتا تھا اور میں تو شہی کو بھی ساری سچائی بتا دینا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے فقط ارادہ ہی ظاہر کیا تھا کہ وہ چیخ پڑی تھیں۔

''ہرگز نہیں مسرور، وہ یہ برداشت نہیں کر پائے گی، وہ بہت حساس و کم عمر ہے، میں تلخ حقیقتوں کو اس پر آشکار کر کے اس کی معصومیت داغدار نہیں کر سکتی۔'' وہ رضیہ بیگم کی وجہ سے خاموشی اختیار کر گئے تھے وگرنہ وہ سچائی بتا دینا چاہتے تھے وہ اور یہ ضروری بھی ہو گیا تھا کیونکہ وہ اصل بات جاننے کے بعد اپنے سالوں کی محنت

اکارت کرنے چلی تھی کیونکہ شاہ تاج کی ضد قائم تھی کہ وہ بھی، نہیں تو عطیہ بھی نہیں اور اس کے کیئریر اس کی محنت کا خیال کرتے ہوئے رضیہ بیگم نے خدشات، وہمات کے ساتھ اپنے دل پر پتھر رکھ کر اسے عطیہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی، مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتیں جو ڈوبے ہی جا رہا تھا، ساتھ خیریت سے لوٹ آنے کی دعا لب پر تھی اور دل کانپ رہا تھا کسی انہونی کے ڈر سے اور جس انہونی سے بچنے کے لئے انہوں نے شہر چھوڑا تھا، ڈر کے مارے گھر سے ہی نکلنا چھوڑ دیا تھا وہ انہونی کہیں اپنے مقررہ وقت پر ہی ہونے والی تھی کہ مالک کل کی رضا کے بغیر تو اک پتہ بھی نہیں ہل سکتا، کوئی کسی سے مل کیسے سکتا ہے؟

☆☆☆

''عطیہ! مجھے گاؤں کی سادہ سی زندگی ہمیشہ سے بہت پسند رہی ہے، میرا دل کرتا تھا کہ کاش میں کسی گاؤں میں پیدا ہوئی ہوتی، کھیتوں میں کام کرتی، بکریاں چراتی، بھینسوں کو چارہ کھلاتی، دودھ دوہتی اور یہاں آ کر مجھے بہت اچھا لگا ہے یہاں کے لوگ کتنے سادہ کتنے معصوم ہیں، یہاں سے جانا میرے لئے بہت مشکل ہوگا عطیہ۔'' وہ اسے بہت حیرانگی سے دیکھ رہی تھی کہ اس نے ایسی کسی خواہش کا پہلے ذکر نہیں کیا تھا، اسے حیرت کے ساتھ اب ہنسی بھی آنے لگی تھی کہ وہ حقیقت جانتی تھی اور وہ جیسی خواہش دل میں بسائے ہوئے تھی اس حقیقت کے پیش نظر تو وہ کھیتوں میں کام کرنے والی نہیں ان کھیتوں کی مالک ہوئی۔

''تم کیا سوچنے لگیں، میں مذاق نہیں کر رہی، یہ میری خواہش ہے عطیہ۔'' وہ خیال سے چونکی اور ہاتھ جھاڑتی کھڑی ہوگئی۔

''انسان جو ہوتا ہے اسے بس اسی پر شکر ادا کرنا چاہیے، کہ اللہ نے تو ویسے بھی تمہیں بہت سہل زندگی عطا کی ہے اور جو زندگی تمہیں متاثر کر رہی ہے، وہ فسوں خیز نہیں بے حد دردناک ہے، کیونکہ منہ اندھیرے سے رات کی تاریکی تک کام کرنا اور پیٹ بھر کر کھانا نہ ملنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے تم کبھی تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ تم نے صرف سہولتیں اور آسائشیں دیکھی ہیں اور گاؤں کی لائف ہرگز بھی سہولت آمیز اور آسائشات سے مزین نہیں ہوتی کہ یہاں کسان کی بیٹی کی بھی آنکھ نم ہوتی ہے اور جاگیر دار کی بیٹی کی بھی، ایک کو غریبی رلاتی ہے تو دوسری کو امیری۔'' وہ کافی گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد بولی تھی کہ وہ ایک حساس لڑکی تھی اور لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی بچپن سے جاری تھا، وہ چیزوں کو آبزرو کرنے کے فن سے واقف تھی اور یہاں آ کر تو اخباروں اور ڈراموں میں دیکھی باتیں جھوٹ لگنے لگی تھیں کہ ان میں تو کچھ بتایا ہی نہیں جاتا اور وہ اپنی آنکھوں سے ظلم ہوتے دیکھ رہی تھی، کسان کی مشقت، جاگیردار کی اجارہ داری، وہ یہاں آ کر بہت دکھی ہوگئی تھی۔

''عطیہ! یہ سب تم کیسے کہہ سکتی ہو، جو تم کہہ رہی ہو ایسا مجھے تو محسوس نہیں ہوا، تو کیا اماں صحیح ہی کہتی ہیں کہ میں بہت بے وقوف ہوں۔'' وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے دلگرفتگی سے بولی تھی۔

''تم بے وقوف نہیں ہو، تم بہت معصوم ہو۔'' وہ اس کے سادہ سے گلابی چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی تھی اور وہ کھل کر تی ہنسی ہنس دی تھی اور حمزہ سکندر جو درخت سے قدرے فاصلے پر موجود تھا اور ان دونوں کی گفتگو ملاحظہ کی تھی آواز کے بعد چہرے اور چہرے کے بعد ہنسی نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں؟" حمزہ سکندر نے منشی کرم داد سے پوچھا تھا۔
"چھوٹے مالک شہر سے آئی ہیں، اخبار میں کام کرتی ہیں کوئی کالم شالم لکھنے کے لئے اور بھی لڑکے لڑکیاں ہیں۔"
"یہ سب ٹھہرے کہاں ہیں؟" بات کاٹ کر سوال داغا تھا۔
"ملکوں کی حویلی میں۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولا تھا۔
"ملکوں کی حویلی میں، ملک کب سے علم کے پروردہ لوگوں کی سرپرستی کرنے لگے۔" وہ پرسوچ انداز میں بولا تھا۔
"چھوٹے مالک علم کی سرپرستی کی آڑ میں سیاست کی سرپرستی کی جارہی ہے، الیکشن سر پر ہیں اور ملک الیکشن جیتنے کے لئے ہمیشہ سے ایسے ہی حربے تو استعمال کرتے آئے ہیں۔" حمزہ سکندر کی سوچیں گہری ہونے لگی تھیں اس کو سیاست سے دلچسپی نہ تھی کہ ویسے بھی وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا لیکن وہ اپنے ماحول میں رچا بسا ہوا تھا اور سیاست کرتا نہیں تھا مگر چاہتا یہی تھا کہ ہر سیاسی جیت اس کے خاندان کا مقدر بنے۔
"شہر سے جو لڑکے لڑکیاں آئے ہوئے ہیں ان سے میری ملاقات کا انتظام کرو کرم داد، کہ کچھ حربے تو ہمیں بھی آزمانا ہوں گے۔" اس نے زیر لب مسکرا کر مونچھوں پر ہاتھ پھیرا تھا اور مضبوط قدم اٹھاتا جیپ میں آبیٹھا تھا اور کرم داد کو انتظام کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی انتظام خود بخود ہو گیا کیونکہ اسے سڑک کے بیچوں بیچ وہ دونوں بیٹھی ہوئی مل گئیں تھیں اس لئے اسے گاڑی کو بریک لگانے پڑ گئے تھے اور وہ دونوں آواز پر چونکیں تھیں اور وہ جیپ سے اتر آیا تھا۔
"کیا ہوا؟" عطیہ اس کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس کے پوچھنے پر سمجھ نہیں آیا کہ بتائے یا نہیں؟ جبکہ اس نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔
"مے آئی ہیلپ یو۔" اب کے اس نے سڑک پر بے نیازی سی بیٹھی شاہ تاج کو دیکھا تھا وہ روتی ہوئی اتنی معصوم و پیاری لگی کہ وہ بے اختیار سا اسے دیکھے گیا۔
"عطیہ! پلیز کچھ کرو، مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ اس کی آواز پر چونکا اور نگاہ کا زاویہ بدلا تو اسے سڑک پر خون نظر آیا اور اس کے پوچھنے پر عطیہ نے بتایا کہ اس کے پیر میں کانچ چبھ گیا تھا کیونکہ اس کی سلیپر ٹوٹ گئی تھی اور وہ ننگے پیر چل رہی تھی، اس نے کرم داد کو فون کیا اور اس سے موڑھے منگوائے اور عطیہ سے کہا کہ وہ زخمی لڑکی کو سہارا دے کر ایک پر بٹھائے پیر وہ دیکھ لے گا کیونکہ وہ ڈاکٹر ہے۔
"تھینک یو سو مچ، کہ آپ نے ہماری مدد کی۔" عطیہ اس کی مشکور ہوئی تھی۔
"نو تھینکس، اٹس مائی ڈیوٹی۔" وہ شائستگی سے بولا تھا۔
"دیکھو یہ کتنا پڑھا لکھا ہے، ڈاکٹر ہے اور تم کہہ رہی تھیں کہ یہاں سب جاہل اجڈ ہیں، تو کیا یہ ہینڈسم ہماری طرح شہر سے آیا ہے؟ یا تم غلط کہہ رہی تھیں۔" وہ اپنے طور پر تو دھیمے لہجے میں بولی تھی اور عطیہ نے اسے گھورتے ہوئے چپ رہنے کو کہا تھا تب ہی وہ بول پڑا تھا۔
"میں شہر سے نہیں آیا یہی کا رہنے والا ہوں اور ایک میں ہی نہیں میرے خاندان کے لڑکے اور لڑکیاں بھی تعلیم یافتہ ہیں، آپ سردار قاسم کی حدود میں کھڑی ہیں ملک بلاول کی حدود میں نہیں آپ کو یہاں پڑھے لکھے اور وہاں جاہلوں سے آپ کا واسطہ پڑے گا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"آپ ملک بلاول کی رشتے دار تو نہیں لگتیں کہ آپ لوگ حلیے سے ہی شہری لگ رہی ہیں، یہاں ہمارے گاؤں میں کسی خاص مقصد سے آئی ہیں؟" وہ سلیقے سے بات کرنے کے فن سے بہ خوبی واقف تھا اور عطیہ نے آنے کا مقصد بتا دیا تھا۔

"جان کر بہت خوشی ہوئی، اگر ہماری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں، کرم داد دونوں خواتین کو باحفاظت ان کے مقام تک چھوڑ آؤ" دھیمے سے کہتا وہ عطیہ کو خاص اور اسے بہت ہی خاص لگا تھا پھر بعد میں وہ حمزہ سکندر سے ملی تھی اور جس سے مل کر بات کر کے اسے بہت اچھا لگا تھا تو عطیہ کو کافی ہیلپ ملی تھی مگر تیسری ملاقات کی نوبت نہیں آسکی تھی۔

☆☆☆

وہ سب آٹھ لڑکے لڑکیاں آئے تھے تو یں شاہ تاج تھی اپنے کلاس فیلو امجد کے اثر رسوخ کی وجہ سے ملک بلاول کے مہمان تھے اور ان سے مل کر شاہ تاج کا براہ راست سامنا نہیں ہوا تھا نہ بات ہوئی تھی، وہ دونوں اس وقت باہر سے آئی تھیں اور ملک بلاول زمینوں پر جانے کے لئے نکل رہے تھے، عطیہ کے سلام کرنے پر ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور شاہ تاج کو دیکھ تو یوں ساکت ہوئے تھے کہ اس کے سلام کا جواب تک دینے کا خیال نہیں آیا تھا جبکہ وہ تو ان کی جمی نگاہوں سے کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"عطیہ! یہ مجھے ایسے گھور گھور کے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" وہ عطیہ کے کان میں تقریباً گھس کر بولی تھی۔

"ملک انکل! یہ میری چھوٹی بہن شاہ تاج ہے۔" وہ چونکے، خود کو کمپوز کرنا مشکل تو لگا مگر وہ خود کو کمپوز ڈ کر گئے اور اس کا حال احوال دریافت کیا تو یوں لگا جیسے کئی برس پہلے کا وقت لوٹ آیا ہو اور وہ اسے دیکھنے لگے تھے، وہی گلابی چہرہ، سیاہ آنکھیں آنکھوں پر پہرہ دیتیں سیاہ خمدار پلکیں، لمبی کھڑی ستواں ناک، پتلے پتلے عنابی لب، متناسب قد، اس کا سراپا انہیں کئی سال پیچھے لے گیا تھا، وہ ان کی جانچتی نگاہوں سے گھبرائی بڑی تیزی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی مگر دور تک ان کی نگاہ نے اس کا پیچھا کیا تھا اور وہ نہ جانے کیوں یکدم ہی بہت پریشان ہو گئی تھی اور اس نے واپس جانے کی رٹ لگا دی تھی۔

"تمہیں ایکدم ہوا کیا ہے؟ ابھی مجھے کافی ریسرچ کرنی ہے ابھی کیسے جا سکتے ہیں؟" عطیہ کچھ غصہ سے بولی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں پتہ عطیہ، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، مجھے لگ رہا ہے بہت غلط ہونے والا ہے، مجھے اماں بہت یاد آ رہی ہیں، پلیز عطیہ گھر چلو۔" وہ ایکدم ہی رو پڑی تھی اور اس کے بعد وہ یوں بضد ہوئی کہ اگلے ہی دن عطیہ نے واپسی کا انتظام کیا پھر وہ دونوں گروپ کے ایک لڑکے اور لڑکی کے ساتھ کراچی واپس آ گئیں، مگر اس کا رویہ ان سب کی سمجھ سے باہر بھی تھا اور پریشان کن بھی۔

"شہی، کیا ہوا ہے؟ کیوں اتنا رو رہی ہو؟"

"آپ مجھے بہت یاد آ رہی تھیں اماں۔" وہ ماں کے کندھے سے لگی سسک رہی تھی۔

"اب آ گئی ہو نہ اپنی اماں کے پاس، اب جا کر فریش ہو جاؤ، میں تم دونوں کے لئے کھانا لگاتی ہوں۔" انہوں نے اپنی لاڈلی کے ماتھے پہ آئے بال سمیٹے تھے اور پیشانی چوم لی تھی اور وہ آنسو رگڑتی کمرے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ ڈور بیل بجی تھی۔

"عطیہ! تم جا کر فریش ہو، میں دیکھ لوں

گی، تمہارے ابا آ گئے ہوں گے۔" وہ عطیہ کو روکتیں خود دروازہ کھولنے بڑھی تھیں، یہ وقت مسرور درانی کے آنے کا تھا انہوں نے بغیر تصدیق کے دروازہ کھولا اور جو چہرہ نظر آیا پہلی نگاہ میں تو نہیں مگر وہ اسے پہچان ضرور گئیں، ان کے چہرے پہ سائے لہرانے لگے، رنگت زرد پڑنے لگی تھی جبکہ وہ مسکرائے تھے اور اسی وقت مسرور درانی آفس سے آ گئے تھے، انہوں نے اپنی ہی عمر کے اس اجنبی شخص کو دیکھا تھا اور ہلکے ہلکے لرزتی ہوئی رضیہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"رضیہ!" اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ چند قدم چلتیں ان کا بازو دبوچ گئی تھیں۔

"کون ہے یہ شخص، ہمارے گھر میں کیا کر رہا ہے اور تم اتنا ڈری ہوئی کیوں ہو؟ سب ٹھیک تو ہے؟" انہوں نے ایک ساتھ کتنے ہی سوال کر ڈالے تھے اور وہ کچھ کہہ ہی نہیں پائی تھیں کہ وہ شخص بول اٹھا تھا۔

"مجھے ملک بلاول کہتے ہیں، آپ کی زوجہ محترمہ کا سابقہ شوہر ہوں اور شاہ تاج کا باپ، اتنا تعارف کافی ہے یا پہلے زبردستی کی شادی، شادی سے طلاق اور طلاق سے فرار تک کی کہانی سناؤں؟" وہ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدہ مگر بارعب لہجے میں بولے تھے اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگے تھے، رضیہ بیگم کی حالت خوف سے خراب ہونے لگی تھی اور ان کی حالت اس شخص کی ہر بات کی گواہی دینے کو کافی تھی۔

"آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟" انہوں نے بیوی کو ریلیکس رہنے کا آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا اور ملک بلاول کی جانب گھوم گئے تھے۔

"لمبی چوڑی بات کرنے کا میں قائل نہیں ہوں، صاف سیدھی بات کہوں گا کہ میں یہاں اپنی بیٹی کو لینے آیا ہوں۔"

"وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔" وہ ملک بلاول کی بات کے درمیان چیخی تھیں۔

"وہ میری ہی بیٹی ہے، جسے تم لے کر فرار ہو گئی تھیں، میں نے ماضی دہرانے آیا ہوں نہ ہی کوئی بدنظمی چاہتا ہوں، میری بیٹی میرے حوالے کر دو، خاموشی سے چلا جاؤں گا، آئیں بائیں شائیں کرو گی تو مجھے اچھے سے جانتی ہو مجھے انگلی ٹیڑھی کر کے اپنا مقصد پورا کرنا خوب آتا ہے، فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے سیدھے راستے سے مجھے میری بیٹی دینی ہے یا؟ یہ تو طے ہے کہ اب میں یہاں سے اپنی بیٹی لئے بغیر تو جانے سے رہا۔" وہ اپنے مخصوص بے لچک بارعب لہجے میں کہتے ان کے قدموں تلے سے گویا زمین ہی نکال لے گئے تھے۔

"میں تمہیں اپنی بیٹی کسی قیمت پر نہیں دوں گی۔" ان کا لہجہ کانپ رہا تھا اور وہ مسکرانے لگے تھے۔

"ایسے ہی دعوے مجھ سے شادی نہ کرنے کے بھی کیے تھے پھر ہوا کیا تھا جیت میری یعنی ملک بلاول کی ہوئی تھی، آج بھی میں ہی فاتح ٹھہروں گا۔" وہ زعم سے بولے اور اندر کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

"مسرور روکیں، اس شخص کو اس نے میری زندگی برباد کر دی تھی، میں اسے اپنی بیٹی کی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گی۔" وہ چلائی تھیں اور وہ ملک بلاول کی باتوں سے اس کے عزائم کا جائزہ لیتے چونکے مگر انہوں نے اسے اندر بڑھنے سے نہیں روکا کہ اس طوفان سے سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔

"دیکھو رضیہ رونے ڈرنے چیخنے چلانے

سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، سنبھالو خود کو ہم اس سے بات کرتے ہیں، اللہ بہتر کریں گے۔" وہ بیوی کو تسلی دیتے اندر لے آئے تھے ملک بلاول کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ انہیں بیٹی چاہیے سیدھے راستے لے جانے دیں گے تو اس سے ملنے کا راستہ کھلا رہے گا، اگر وہ اوچھے ہتھکنڈوں کے بعد لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو رضیہ بیگم کے لئے بیٹی سے ملنے کا ہر رستہ بند ہو جائے گا، وہ وقت دینے کو تیار نہ تھے مگر مسرور درانی نے اتنے سبھاؤ سے بات کی تھی کہ انہیں مانتے ہی بنی اور وہ کل آنے کا کہہ کر چلے گئے۔

"آپ نے کیوں اس کی امید بندھائی مسرور؟ میں اپنی بیٹی اس گھٹیا شخص کے حوالے کبھی نہیں کروں گی۔" وہ شوہر پر بگڑی تھیں۔

"میں نے امید نہیں بندھائی سوچنے کے لئے وقت لیا ہے، کیونکہ وہ گھٹیا شخص ہی شاہ تاج کا باپ ہے اور اس کے تیور دیکھے تھے نہ وہ اسی وقت شاہ تاج کو لے جانا چاہتا تھا، تمہیں وقت مل گیا ہے، سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو کہ وہ با اختیار ہے۔" ان کی نگاہ بہت دور تک دیکھ رہی تھی۔

"مطلب کیا ہے آپ کی بات کا، میں شاہ تاج اسے دے دوں۔"

"عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے رضیہ اور مجھ سے زیادہ تم اس شخص کو جانتی ہو اس لئے جذباتی ہو کر نہیں عقل سے کام لیتے ہوئے کوئی فیصلہ کر لو، ویسے بھی وہ اچھا ہے برا ہے جیسا بھی ہے، ہے تو شہی کا باپ ہے اسے ساتھ لے جانے کا شرعی و قانونی حق رکھتا ہے، مگر تم یہ بھی جانتی ہو وہ ایسا محبت میں نہیں کر رہا، وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے تم سمجھ سکتی ہو اور تمام فائدے، نقصانات تمہارے سامنے ہیں تو سوچ سمجھ کر فیصلہ لو، غصہ میں اس نے کچھ غلط کیا تو سر پکڑ کر روؤ گی، جیسے اب تک روتی رہی ہو۔" وہ تجزیہ کے بعد جو مناسب سمجھتے تھے کہہ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں اور گھر میں سب سے چھوٹی تھیں، این ای ڈی سے کیمیکل انجینئرنگ میں ماسٹرز کر رہی تھیں، ملک بلاول سے جامعہ سے واپسی میں ٹاکرا ہوا تھا، وہ ان کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی، ملک بلاول نے اس وقت مدد کی تھی بعد میں پیچھا لے لیا تھا وہ شادی کرنا چاہتے تھے مگر وہ مسرور درانی جو ماموں زاد تھے ان سے محبت کرتی تھیں، انکاری ہو گئیں مگر ملک بلاول نے بھی پیچھا لے لیا اور ایک دن فون کر کے ان کے بڑے بھائی سے کہہ دیا کہ وہ رضیہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں، رضیہ بھی ایسا چاہتی ہے مگر گھر والوں کے سامنے کہہ نہیں پا رہی، اسی طرح کے فون جس میں ملک بلاول اور رضیہ کی محبت کی داستانیں بیان کی جاتیں مسرور درانی کے گھر پر بھی کیے گئے، مسرور درانی شک کا شکار ضرور ہوئے مگر انہوں نے رضیہ سے تصدیق ضرور کی تھی اور ان کی صداقت پر مسرور درانی یقین بھی لے آئے تھے مگر مسرور درانی کی والدہ جو پہلے بھی رشتے پر خوش نہ تھیں بیٹے کی وجہ سے راضی ہوئیں تھیں وہ اور مسرور درانی کے گھر والے سب رضیہ سے بدظن ہو گئے تھے اور جب ملک بلاول خود اپنا رشتہ لائے تو رضیہ انکار نہ کر سکیں کیونکہ ملک بلاول نے ان کی فیملی کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دی تھی اور ان کا سب کے سامنے کیا جانے والا اقرار انہیں سب کی نظروں سے گرا گیا، چند ہی گھنٹوں میں ان کا نکاح کر کے ملک بلاول کے ساتھ رخصت کر دیا، ہر قسم کا رشتہ ختم کر کے، مسرور درانی کی والدہ نے بھی ان کی شادی اپنی بھانجی سے کر دی۔

رضیہ، ملک بلاول کے ساتھ خوش نہ تھیں کہ وہ اچھے اوصاف حرکات کے مالک نہ تھے مگر وقت گزرتا رہا اور یونہی تین برس بیت گئے، وہ اپنوں کی شکل دیکھنے کو ترستیں گھٹ گھٹ کر جیتی رہیں، بیمار تھیں، علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں وہیں پورے تین سال بعد مسرور درانی سے ملاقات ہو گئی، جن کی بیوی ہاسپٹلائز تھیں، ملک بلاول کو رضیہ کا مسرور درانی سے بات کرنا اور ان کی دو سالہ بیٹی کو گود میں لے کر پیار کرنا، کچھ بھی اچھا نہیں لگا تھا، گھر آ کر دونوں کی کافی لڑائی ہوئی، ملک بلاول کے شک اور زہریلی باتوں نے ان کے بے جان وجود کی رہی سہی جان بھی کھینچ لی تھی، ملک بلاول ان سے تنگ آ چکے تھے کہ انہوں نے اتنا وقت تو کسی عورت کو دیا ہی نہ تھا، ان کی ایک خاندانی بیوی تھی اس سے ایک بیٹا تھا، رضیہ تو محض ضد اور خوشی کا باعث تھیں، ضد پوری ہو چکی تھی، خوشی ہرن ہو چکی تھی ان سے جان چھڑانا تو کافی عرصے سے چاہ رہے تھے موقع ملا تو اسی کو غنیمت جانا اور کردار پر انگلی اٹھاتے ہوئے شک کے کٹہرے میں کھڑا کر کے انہیں اپنی زندگی سے نکال دیا، وہ ذلت و طلاق لئے گھر لوٹیں تو اپنوں کے سفید ہو جانے والے خون نے جوش نہ مارا، ان کا تو کوئی سہارا، آسرا ہی نہ تھا ایدھی سینٹر چلی گئیں، مسرور درانی بیوی کے چالیسویں کا کھانا ایدھی سینٹر میں دینے آئے تو رضیہ سے ملے، رضیہ نے انہیں ساری حقیقت لفظ بہ لفظ بتا دی اس دوران اس کی ایک بیٹی بھی دنیا میں آ چکی تھی جس کا علم ملک بلاول کو نہ تھا اور یوں ساڑھے تین سال کٹھن زندگی گزارنے کے بعد وہ مسرور درانی کی بیوی کے مرنے کے بعد اجڑ جانے والے آشیانے سہم جانے والی بچی کو ماں کا پیار دینے کے لئے چلی آئیں، مگر انہوں نے مسرور درانی کی بیٹی کو ماں کا پیار دیا تو وہ بھی ان کی بیٹی کے لئے باپ ہی ثابت ہوئے، رضیہ بیٹی کی پیدائش سے ہی خوفزدہ رہیں کہ انہیں لگتا تھا کہ جب ملک بلاول کو اس بات کا پتہ چلے گا تو وہ بیٹی ان کے پاس نہیں رہنے دیے گا، انہوں نے اٹھارہ برس ڈر ڈر کر گزرائے اور جب شاہ تاج ماں کا سا رنگ روپ اس کی شباہت اختیار کرتی گئی تو خوف دو چند ہو گیا اور انیسویں سال بعد ان کا شک، وہم دل کا ڈر سچ ثابت ہو گیا اور ملک بلاول جو اٹھارہ برس بیٹی کے وجود سے نا آشنا رہا، یکدم ہی اس کا وارث بن کر آ گیا، رضیہ ایسا ہرگز نہیں چاہتیں، انہوں نے ساری حقیقت شاہ تاج کو بھی بتا دی وہ بھی ماں کے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی اور جب اگلے دن ملک بلاول آئے رضیہ سے زیادہ خود اعتمادی سے وہ باپ سے ملی اور جانے سے صاف انکار کیا مگر وہ کہاں کسی کے انکار کو خاطر میں لائے تھے، زبردستی اسے وہاں سے لے گئے، حویلی آ کر وہ بہت روئی بہت ہاتھ پیر مارے مگر سب بے سود، یونہی تین ماہ گزر گئے ملک بلاول کی بیوی کو شاہ تاج ایک آنکھ نہ بھائی تھی مگر شوہر کے سامنے خاموشی ہی بھلی تھی، وہ تین ماہ بعد کراچی رضیہ سے ملنے گئی اور ماں سے مل کر آنے کے بعد وہ کچھ نارمل ہو گئی تھی، کمرے سے نکلنے لگی تھی، ملک بلاول کے چھوٹے بھائی کی بیٹیوں اور بہوؤں سے بات چیت کرنے لگی تھی اور کچھ ہی دنوں کے بعد سیر کے لئے گیا ملک صمد حویلی لوٹ آیا، جو ملک بلاول کے چھوٹے بھائی کا اکلوتا بیٹا تھا، صمد کو شاہ تاج پہلی ہی نگاہ میں اچھی لگی تھی وہ اس سے بات کرنے فری ہونے کی کوشش کرتا تھا مگر اسے صمد ایک آنکھ نہیں بھایا تھا، وہ اس کی بات کا ڈھنگ سے جواب تک نہیں دیتی تھی، ایک دن حویلی کی سب لڑکیاں تفریح

کے لئے گئی تھیں، شاہ تاج بھی ساتھ تھی ان لوگوں کی باتوں میں دل نہ لگا تو وہ ملازمہ کے ساتھ واک کے لئے نکل گئی اور تبھی اس کی ملاقات حمزہ سکندر سے ہوئی تھی، یوشی کو اس کے آواز دے کر روکنے اور خیریت دریافت کرنے پر پہلے پہل حیرت ہوئی تھی مگر جب یہ خیال آیا تھا کہ وہ یقیناً دونوں خاندانوں کی دشمنی سے ناواقف ہوگی حیرت ختم ہوگئی تھی، (ملک بلاول کی بیٹی شہر سے آئی ہے سب ہی اس بات سے واقف ہوگئے تھے) اور ان دونوں کو بات کرتے ہوئے ملک صمد نے دیکھ لیا تھا اور وہ چیل کی طرح ان کے سر پر آن پہنچا تھا، یوشی کو خونخوار نگاہوں سے گھورتا وہ شاہ تاج کی طرف مڑا اور اسے گھورتے ہوئے چلنے کو کہا۔

"آپ جائیے میں کچھ دیر میں آ جاتی ہوں۔" اس کا یہ کہنا غضب ہوگیا اس نے شاہ تاج کی کلائی مضبوطی سے جکڑی اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا اپنی گاڑی تک لے گیا، اندر دھکیلا، فل اسپیڈ میں گاڑی چھوڑی، رَش ڈرائیونگ کرتا حویلی پہنچا اسے جیسے بٹھایا تھا ویسے ہی اتارا اور گھسیٹتا ہوا حویلی کے اندرونی حصے میں لے آیا، بیٹھک میں بیٹھے چھوٹے بھائی سے بات کرتے ملک بلاول چونک اٹھے۔

"یہ سب کیا ہے صمد؟" وہ بولے نہیں دھاڑے تھے۔

"مجھ سے نہیں اپنی چہیتی شہری بیٹی سے پوچھیے، دشمنوں کے بیٹے سے کھڑی عشق کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔" جھٹکے سے اس کی کلائی آزاد کی تھی وہ اوندھے منہ فرش پر گری تھی، ماتھے سے درد کی لہر اٹھی تھی وہ اس کی جرأت پر حیران پریشان تھی اس کے الزام پر لمحے کے ہزارویں حصے میں اٹھ بیٹھی تھی۔

"بکواس بند کیجئے اپنی۔" وہ چیخی تھی۔

"دیکھ رہے ہیں تایا سائیں، اپنی دختر کی بدلحاظی ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔" وہ کف اڑانے لگا تھا۔

"بابا سائیں یہ بکواس کر رہے ہیں، میں تو یوشی سے بات کر رہی تھی جب پہلے میں عطیہ کے ساتھ گاؤں آئی تھی تب یوشی نے عطیہ کی بہت مدد کی تھی، اس لئے انہیں دیکھا تو سلام دعا کرنے لگی تھی اور یہ نہ جانے کیا سمجھے؟ اتنی بدتمیزی کی میرے ساتھ، مجھے وہاں سے زبردستی گھسیٹ لائے ہیں، انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا مجھ سے اس طرح پیش آنے کا۔" اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

"بکواس کی یا جھوٹ بولا اور کارنامے چھپانے کی کوشش کی تو زندہ زمین میں گاڑھ دوں گا۔" وہ بدلحاظی سے چیخا تھا۔

"آپ نے مجھ پر بہتان باندھنے کی کوشش کی تو میں آپ کا وہ حشر کروں گی جو ساری عمر یاد کریں گے۔" وہاں موجود کسی کو بھی امید نہ تھی کہ وہ ملک صمد کے منہ پر تھپڑ دے مارے گی، ملک صمد نے اس کی کلائی جکڑ لی تھی توہین پر اس کی آنکھیں لہو چھلکانے لگی تھیں، ملک بلاول نے ہی آگے بڑھ کر بیٹی کو اس کے کمرے میں بھیجا تو وہ اور چیخنے لگا تھا شاہ تاج کو برا بھلا کہتے ہوئے گالیاں دینے لگا تھا۔

"بس ملک صمد، وہ ملک بلاول کی بیٹی ہے ذرا زبان سنبھال کے۔" وہ بارعب لہجے میں بولے تھے تو اس کی بولتی بند ہوگئی تھی اور وہ کچھ دیر بعد منمنایا تھا۔

"آپ اسے شہ دے رہے ہیں تایا سائیں اور اس نے جو میری تذلیل کی اسے کیسے آپ نظر انداز کر سکتے ہیں؟"

"تذلیل کروانے کا خود تمہیں شوق چڑھا تھا، چار ماہ میں شاہ تاج کو اتنا تو جان گئے ہیں کہ یقین سے کہہ سکیں کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، نا تم اس پر انگلی اٹھاتے نہ وہ سب ہوتا، خیر جانے دو اس قصے کو میں خود دیکھ لوں گا سب کچھ۔" وہ اپنے طور پر بات ختم کر گئے مگر وہ تو زخمی ناگ بن گیا تھا اس پر کسی نے پہلی دفعہ ہاتھ اٹھایا تھا وہ بھی بھرے مجمعے میں وہ بھی کسی عورت نے، وہ اپنی تذلیل کا ہر صورت بدلہ لینا چاہتا تھا، کب؟ کیسے؟ موقع کی اسے تلاش تھی اور موقع اسے جلدی ہی مل گیا تھا، حویلی کے سب افراد کسی قریبی عزیز کی شادی میں گئے تھے، شاہ تاج بیمار تھی اس لئے اس نے جانے سے معذرت کر لی، حویلی کی ملازماؤں کو ملک صمد نے خود ہی حویلی سے بھیج دیا کہ اس کی شاہ تاج پر اول روز سے ہی بری نظر تھی اور اسے اب تو اپنی تذلیل کا بدلہ بھی لینا تھا اس لئے موقع و تنہائی کا اس نے فائدہ اٹھانے کا پورا ارادہ کر لیا تھا اس نے شاہ تاج کے ساتھ دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی کہ اتنے میں ملک بلاول جو شادی پر نہ گئے تھے اور ڈیرے سے طبیعت بوجھل محسوس کرتے خلاف عادت بیچ پنچائیت سے اٹھ کر گھر آ گئے تھے تبھی دوسروں کی عزتیں پامال کرنے والے شخص کو ایک ہی لمحہ میں عزت کی اہمیت و معنی سمجھ آ گئے تھے، بیٹی کی عزت کے آبگینے کو تو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر ضمیر کی عدالت میں جا کھڑے ہوئے تھے اور اگلے دن بیٹی کے رونے پر وہ اسے واپس بھیجنے کا فیصلہ کر چکے تھے، مگر جن کی قسمتوں میں آزمائش لکھی جا چکی ہو انہیں آزمائشوں کی کھائی میں چاہے ان چاہے طور اترنا ہی پڑتا ہے، حمزہ سکندر کے خاندان سے ملک خاندان کی نسلی دشمنی تھی ورجو اس وقت بھڑک کر سامنے آئی، وہ اک سرد آدھی رات تھی، حمزہ سکندر کا چھوٹا بھائی شہر سے آ رہا تھا کہ لڑکی کی چیخ کی آواز پر اس نے گاڑی روکی تھی اور آواز کے تعاقب میں آگے بڑھنے لگا تھا کہ وہ گھبرائی و خوفزدہ اٹھارہ انیس سال کی لڑکی اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی اور اس کا بازو تھام کر اس کی اوٹ میں ہو گئی تھی جبکہ ملک صمد اسے دیکھ ڈرنے یا گھبرانے کی بجائے غصہ میں آ گیا تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ملک صمد، تم لوگوں نے تو اپنی عزت و غیرت بیچ کھائی ہے، دوسروں کی عزت تو محفوظ رہنے دو۔" وہ کڑے تیوروں سے اسے گھور رہا تھا کہ اس لڑکی کا خوف سے چلانا، دوڑ کر اس تک آنا اور فریاد کرنا اس کے خون کو کھولا گیا تھا اور وہ شرمندہ ہونے کی بجائے جواباً اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"آج تم ہمارے علاقے میں چلے آئے ہو موسیٰ سکندر، زندہ بچ کر جانے دیا تو اپنے باپ کا نہیں۔" وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا اور اسے بری طرح پیٹنے لگا اور وہ اپنا بچاؤ بھی نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ وہ بائیس برس کا درمیانی جسامت کا لڑکا تھا اس کے برعکس ملک صمد بھاری ڈیل ڈول کا تقریباً چونتیس برس کا توانا مرد تھا، وہ لڑکی اس صورتحال پر مزید پریشان ہو گئی تھی، سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے، جب ہی اس کی نگاہ ایک موٹے ڈنڈے پر پڑی تھی اور جسے اٹھا کر اس نے موسیٰ سکندر کو بری طرح پیٹتے ملک صمد کے سر پر مارنا چاہا تھا مگر وہ اسی وقت سیدھا ہوا اور اس کو پلٹتے دیکھ کر ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے اسے گالی دیتے ہوئے پکڑ لیا۔

"تو اور مجھے مارے گی، ہاتھ نہیں توڑ دوں گا میں تیرے۔" اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر بری

طرح جھکا تو وہ کراہ اٹھی تھی۔
"چھوڑ دیں مجھے ملک صاحب، جانے دیں مجھے۔" وہ سسکی تھی اور اس نے قہقہہ لگا کر اسے دیکھا۔
"ہاں جانے دوں جانے ہی دینا ہوتا تو راہ روکتا ہی کیوں؟" تمسخر سے بولا تھا اور اتنے میں اسے اٹھ کر جیب سے ریوالور نکالنے کا موقع مل گیا اور اس نے ٹریگر پر انگلی جمائی تھی، ٹھاہ کی آواز پر وہ پلٹا اور ملک اسد کو ریوالور تانے اور موسیٰ سکندر کو زمین بوس ہوئے دیکھا اسے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہونے لگی تھی۔
"اسد! یہ کیا کر دیا تم نے؟" وہ اب کچھ خوفزدہ ہو گیا تھا کہ زمین بڑی تیزی سے لہو رنگ ہو رہی تھی۔
"ادا میں اس پر گولی نہ چلاتا تو یہ تم پہ گولی چلا دیتا۔" وہ لڑکھڑاتے لہجے میں بولا اور وہ...... وہ اس کی طرف بڑھا نبض چیک کی مگر زندگی کا ناطہ ٹوٹ چکا تا، وہ کیا کریں کیا نہیں کی الجھن میں ہی تھے کہ وہاں حمزہ سکندر چلا آیا تھا کہ کافی دیر قبل اس نے یوشی کو اپنے پہنچ جانے کا بتا دیا تھا مگر وہ نہ پہنچا تو وہ تشویش کا شکار ہوتا ڈیرے سے گھر جانے کی بجائے گاؤں کے داخلی راستے کی جانب بڑھا تھا اور اس کی گاڑی دشمنوں کی حدود میں دیکھ کر وہ کافی تیزی سے اس تک آیا، مگر گاڑی خالی تھی اور باتوں کی دھیمی آواز پر وہ آگے بڑھا اور زمین پر ساکت خون میں لت پت موسیٰ سکندر کو دیکھ کر زمین، آسمان اسے اپنی آنکھوں کے سامنے گھومتے محسوس ہونے لگے تھے۔
"موسیٰ...... موسیٰ...... آنکھیں کھول موسیٰ کیا ہو گیا ہے تجھے؟ آنکھیں کھول موسیٰ۔" وہ اس کا سر زانو پر رکھے گال تھپتھپا رہا تھا جبکہ وہ دونوں وہاں سے فرار ہو گئے تھے، سرداروں کی حویلی میں

ہنگامہ برپا ہو گیا تھا، جوان بیٹے کا لاشہ دیکھ کر بی بی (والدہ) کو سکتہ ہو گیا تھا وہ سب ملکوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے، یوشی اور جمال کو سنبھالا بڑا ہی مشکل ہو رہا تھا لیکن سردار قاسم نے بڑے بیٹے اور چھوٹے بیٹے کے دونوں بیٹوں کو اپنی قسم دے کر قابو کیا ہوا تھا اور پنچائیت بیٹھی تھی اور قتل کی وجہ جیسے ہی دریافت کی گئی جو الزام ملک صمد کی طرف سے لگایا گیا وہ سب بیٹھے سے کھڑے ہو گئے تھے۔
"زبان کو لگام دو ملک صمد، ورنہ میں تمہیں یہیں زندہ گاڑھ دوں گا۔" حمزہ سکندر غصہ سے کف اڑا رہا تھا۔
"تمہارا بھائی اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو لگام نہ ڈال سکا اور تم ہماری زبان کو لگام ڈالو گے، مگر کس بنیاد پر؟ تمہارے چلانے سے حقیقت بدلے گی نہیں، موسیٰ سکندر نے ہمارے گاؤں کی حرارے الٰہی بخش کی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور اس کی عزت بچانے کو ملک اسد کو گولی چلانی پڑی، ارادہ مارنے کا نہیں تھا۔"
"بکواس بند کر دو ملک صمد ہمارا پوتا ایسا نہیں تھا۔" سردار قاسم دھاڑے تھے۔
"وہ ایسا ہی تھا، یقین نہیں تو الٰہی بخش کی دھی کو بلا کر تصدیق کر لیں۔" وہ پرسکون انداز میں بولا تھا کہ اس نے نوشابہ کو جھوٹ بولنے کے لئے مجبور کر دیا تھا نوشابہ کی چھوٹی بہن اس کے قبضہ میں تھی، ماں باپ کی جان لینے کی دھمکی الگ دی ہوئی تھی اس لئے اسے یقین تھا کہ وہ جھوٹ ہی بولے گی اور اسے جھوٹ کھلنے کا خطرہ نہیں تھا۔
"ہمیں کسی سے تصدیق نہیں کرنی، ہمیں اپنے بیٹے پر پورا بھروسہ ہے اور سردار امانت علی خان، ہمیں انصاف چاہیے، جوان جہان بیٹے کو

دفنا کر آیا ہوں، انصاف چاہتا ہوں، الزام نہ سننے آیا ہوں نہ ہی سنوں گا، ملکوں نے اپنی حدود میں میرے بیٹے کی جان لی ہے اور الزام بھی میرے ہی بیٹے پر لگا رہے ہیں، جبکہ مجھے وجہ نہیں جاننی ملکوں کا خون چاہیے، آنکھ کے بدلے آنکھ، جان کے بدلے جان۔" سردار سکندر ایکدم ٹھوس دبنگ بے لچک لہجے میں بولے تھے۔

"اور عزت کے بدلے عزت، کیوں ٹھیک کہا نہ میں نے؟" ملک بلاول بولے تھے اور وہ سب انہیں دیکھنے لگے تھے۔

"بات انصاف کی ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان کی ہے تو ہمیں اعتراض نہیں، گولی ہماری طرف سے چلی ہے، جان لی گئی ہے مگر بے سبب نہیں، کسی معصوم لڑکی کی عزت بچانے کے لئے ایسا کیا گیا، سردار سکندر کو بیٹے کی موت کا بدلہ لینا ہے تو پہلے عزت پر ہاتھ ڈالنے کا بدلہ عزت پر ہاتھ ڈالوا کر دیں، پھر شوق سے جان لیں۔" ملک بلاول بہت بڑی بات کہہ گئے تھے سردار غصہ سے کھولتے مارنے مرنے پر تل گئے تھے، پنچائیت کے ممبران نے ہی قابو کیا تھا، معاملہ ٹھنڈا پڑتے ہی پرسکون انداز میں سردار امانت علی خان بولنا شروع ہو گئے۔

"سردار سکندر تم نے بیٹا کھویا ہے، یہ فیصلہ تم پر چھوڑا جاتا ہے کہ تم معاف کرتے ہو خون بہاتے ہو، خون بہا لیتے ہو، مگر خون کا جو سبب سامنے آیا ہے نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے، گاؤں میں سردار، کی بیٹی ہو، ملک کی بیٹی ہو یا کسی مزارعے کی، بہن بیٹیوں کی عزت سانجھی ہے، الٰہی بخش کی بیٹی کو بلایا جائے گا اس سے تصدیق کی جائے گی، سردار موسیٰ پر لگا الزام وہی لڑکی سچ اور جھوٹ ثابت کر سکتی ہے اور اس سب کی روشنی میں ہی آگے کا فیصلہ ہو گا کیونکہ الزام سچ ثابت ہوا تو سردار موسیٰ مجرم بن جائے گا اور مجرم کی سزا کا تعین ہو چکا ہے اس لئے آپ کو خاموشی اختیار کرنی ہو گی، کہ عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کا انجام......"

"سردار امانت علی خان، کچھ کہے بناء تصدیق کے لئے اس لڑکی کو بلائیں۔" حمزہ سکندر برداشت نہ کر سکا تو سختی سے بول اٹھا، سربراہ پنچائیت کو اپنی بات کاٹے جانا پسند تو نہ تھا مگر وہ محض اسے گھور کر رہ گئے اور چند ہی منٹوں بعد نوشابہ کالی چادر میں کانپتے ہوئے وہاں چلی آئی اس نے ڈرتے ڈرتے ملک صمد کو دیکھا تھا اسے نگاہ ہی نگاہ میں اس نے بہت کچھ سمجھایا تھا اور وہ سردار امانت علی خان کے قدموں میں بیٹھے سر جھکائے اپنے باپ کو دیکھنے لگی تھی اور باپ کی آنکھوں سے گرتے آنسو، چہرے پر بکھری بے بسی اور تذلیل کی آندھی اس کا تڑپتا وجود و دل لمحے بھر کو سکڑا تھا۔

"ڈرو نہیں لڑکی جو بات جیسے ہے سب کے سامنے بتا دو کہ سردار موسیٰ نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا یا نہیں؟" وہ دبنگ لہجے میں بولے تھے اور اس کی زبان سردار موسیٰ کہتے ساتھ ہی لڑکھڑا گئی تھی اس میں اتنی ہمت نہیں جمع ہو پا رہی تھی کہ وہ اس شخص کو بے آبرو کر دے، سب کے سامنے اسی پر الزام دھر دے جس کے سبب آج آبرو سے تھی، جس شخص نے جان دے کر اس کی عزت بچائی تھی وہ اسی پر الزام نہ رکھ سکی اور جو کچھ اس نے کہا، ملکوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، فخر سے تنی گردنیں جھک گئیں۔

"سالی تو مجھ پر الزام لگاتی ہے۔" ملک صمد آپے سے باہر ہوتا نوشابہ کو مارنے کو لپکا تھا جسے بروقت ملک بلال نے جکڑ لیا تھا، وہاں کی فضا یکدم ہی تبدیل ہو گئی تھی، ملکوں کا سارا اطمینان

غارت ہو گیا تھا اور سرداروں کی نگاہ کا مرکز وہ لڑکی بن گئی تھی جوان کے بیٹے کی صداقت بیان کر رہی تھی۔

''میری عزت پر ملک صمد نے ہاتھ ڈالا تھا، سردار موسیٰ نے تو اس وقت وہاں پہنچ کر میری مدد کی تھی۔'' وہ روتے ہوئے تفصیل بتا رہی تھی۔

''ملک صمد نے میری چھوٹی بہن رطابہ کو اغواء کر لیا اور مجھے کہا کہ میں سارا الزام سردار موسیٰ پر ڈال دوں وگرنہ وہ میری بہن اور اماں ابا کو جان سے مار دیں گے، میں نے ملک صمد سے وعدہ کر لیا جھوٹ بولنے کا لیکن میں اس شخص پر بہتان نہیں باندھ سکی جو میری آبرو بچاتے بچاتے جان کی بازی ہار گیا۔'' وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی یکدم ہی مجرم بدل گیا تھا جرم مگر وہی تھا۔

''ہم ہمیشہ ہی درمیانی راہ نکالتے آئے ہیں مگر اب پانی سر سے گزر گیا ہے، خون بہا نہیں ہمیں جان کے بدلے جان چاہیے۔'' سردار قاسم پوتے کے قاتل کو دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں بولے تھے اور اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور اجازت پاتے ہی بولنے لگا۔

''جو سچائی الٰہی بخش کی دھی کے ذریعے سامنے آئی ہے میں اس سے آپ سب کی طرح انجان ہی تھا، میں نے سردار موسیٰ کو ادا پر ریوالور تانے دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ اس پر گولی چلا دی، میرا ارادہ قتل کا نہ تھا میں نے محض ادا کی جان بچانی چاہی تھی اور جو بات پنچائیت میں بتائی گئی میرے علم میں بھی وہی سب تھا، مگر اب مجھے اپنے عمل پر از حد شرمندگی ہے کہ کیوں میں نے سردار موسیٰ پر گولی چلائی جبکہ وہ ادا کی جان لینے میں حق بجانب تھا کہ، سردار موسیٰ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ملک صمد کی جان لے لیتا مگر میں نے نہ حالات جاننے کی کوشش کی نہ مجھے کچھ اندازہ ہوا اور میں نے ایک مجرم کو بچانے کے لئے بے گناہ کی جان لے لی، سزا کا حقدار ہوں، سزا سے بچنا نہیں چاہوں گا، ہاں بس اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے جو کیا انجانے میں، ادا کی حفاظت کی نیت سے کیا جبکہ غلط ادا ہی تھے اس لئے ادا کو بھی سزا ملنی چاہیے کہ ادا نے نہ صرف ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کرنی چاہی بلکہ ایک باکردار شخص پر تہمت بھی لگائی۔'' وہ اپنا موقف بیان کر کے چپ کر گیا، سردار قاسم نے بیٹے کو دیکھا آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلہ خیال ہوئے اور وہ بولے۔

''ہم خون بہا لینے کو تیار ہیں مگر ہماری ایک شرط ہو گی۔''

''ہمیں ہر شرط منظور ہے مگر خون بہا کس نوعیت کا ہو گا۔'' کب سے خاموش تماشائی بنے ملک بلاول بولے تھے کہ وہ پہلے ہی جھٹکے سے نہ سنبھلے تھے کہ دوسرا جھٹکا، اکلوتا جوان بیٹا، قتل کر چکا تھا اس کی موت یقینی نظر آ رہی تھی اک روزن جیسے ہی کھلا تو لگا گونگے کو زبان مل گئی۔

''خون بہانے کی نوعیت سردار امانت علی خان جو متعین کریں گے وہ ہمیں منظور ہو گی اور ہماری شرط یہ ہے کہ ملک صمد کو اپنی آدھی جائیداد الٰہی بخش کی دختر کے نام کرنی ہو گی اور اس لڑکی کو اپنے نکاح میں لینا ہو گا۔'' سردار قاسم کے فیصلے پر وہاں موجود ہر شخص کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔

کیونکہ کسی کو بھی امید نہ تھی کہ وہ اس کی اور نوشابہ کی شادی کی شرط رکھیں گے، ملک صمد بھڑک کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''بیٹے کی موت نے دماغ خراب کر دیا ہے تمہارا، میں اس کمی کمین عورت سے نکاح کروں گا، اس کی اتنی اوقات ہے؟'' سب کی طرح ساکت کھڑی نوشابہ کو اس نے خونخوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نفرت و حقارت سے کہا تھا۔

"اس کی اوقات تم سے بہتر کون جانتا ہوگا ملک صمد، اس کمی کمین عورت کی عزت لوٹتے تمہیں اپنے حسب نسب کا خیال نہ تھا، عزت بناتے حسب نسب یاد آرہا ہے، سردار امانت علی خان یہی ہماری شرط ہے جس لڑکی کی عزت بچاتے بچاتے ہمارا بیٹا جان کی بازی ہارا ہے ہمیں اس کو عزت دینی ہے، تحفظ لوٹانا ہے اور اگر ملک نہیں راضی تو ہم خون بہا لینے کو تو تیار ہیں ملک صمد کو گاؤں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے جرم میں سنگسار کرنا پڑے گا اور یہ گاؤں کی اور گاؤں کی بہن بیٹیوں کی عزت کی بقاء کے لئے بہت ضروری ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر دفعہ سردار موسیٰ اور اس جیسے لوگ معصوم عزت کو پامالی سے جان دے کر بچالیں۔" سردار سکندر نے ملک صمد کے لئے بچاؤ کی کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی اور وہ راضی تو نہ تھا مگر ملک بلاول دوسری کوئی راہ نہ پاتے ہوئے مجبور ہو گئے تھے، سردار سکندر کی شرائط پر وہیں پنچائیت میں نوشابہ کا نکاح ملک صمد سے ہو گیا تھا اور خون بہا کے بدلے ملک اسد کی بہن کا نکاح بھی سردار موسیٰ کے بھائی سے ہو گیا تھا حمزہ سکندر نے کسی بھی جذبے کے بغیر انتقام کی آگ میں نکاح نامے پر دستخط کیے تھے اور وہ جو شہر جانے کی مکمل تیاری میں تھی، اسے کچھ بھی بتائے بغیر نکاح نامے پر سائن کروائے گئے تھے کہ وہ نہ وہاں کے رواج جانتی تھی نہ اسے کسی نے بتائے، ملک بلاول نے ہاتھ جوڑ کر نکاح نامے پر اس سے دستخط کرنے کو کہا اور اس نے باپ کے جڑے ہاتھ دیکھ بنا ایک سوال کیے سائن کر دیے اس گھمنڈی، مغرور شخص کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

"اسد کے لئے میں نے آج تمہیں قربان کر دیا ہے، تمہاری زندگی بے حد مشکل ہونے والی ہے، بہت سی تکلیفیں منتظر ہیں تمہاری، مگر اس باپ کو معاف کر دینا جس نے وارث کے لئے نام کے لئے، اپنی نسل کی بقاء کے لئے جانتے بوجھتے بیٹی کو کھائی میں دھکیل دیا ہے۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھے بولے تھے وہ ان کی کوئی بات نہیں سمجھی تھی مگر وقت نے سمجھا دینی تھیں اور کچھ دیر بعد اسی ملگجے کاٹن کے گلابی پرنٹڈ سوٹ میں سرداروں کی حویلی سے آئی دو ملازماؤں کے ساتھ اسے رخصت کر دیا گیا تھا، نہ مہندی لگی تھی، نہ شہنائی بجی تھی، نہ سرخ جوڑا پہنا، نہ ماں کی دعائیں تھیں، نہ خوشی کا احساس تھا اور وہ الجھے ہزار سوال لئے سرداروں کی حویلی آ گئی اور اسے دیکھ کتنی ہی عورتیں چیل کی طرح اس پر جھپٹی تھیں کوئی مار رہا تھا کوئی کوسنے دے رہا تھا اور وہ اپنا قصور تک نہیں پوچھ سکی تھی، ذلت آمیز استقبال کے بعد اسے بتا دیا گیا تھا کہ اس گھر میں اس کی حیثیت نوکرانی کی ہو گی، حمزہ سکندر سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو گا اور پورے دو سال جس شخص کے نام نہاد ہی سہی حوالے سے آئی تھی انجان ہی رہی تھی، وہ ملازماؤں کے ساتھ ہی رہتی، سوتی تھی اور اس نے دھیرے دھیرے وہ کام کرنا سیکھ لئے تھے جنہیں کرنے کی بھی آرزو دل میں مچلا کرتی تھی، رضیہ اس کی شادی کا سن تڑپ ہی تو اٹھی تھی مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے وہ سرداروں کی حویلی جتنی بار بھی آئیں، ہاتھ جوڑ کر بھی نامراد ہی لوٹیں۔

☆☆☆

حمزہ سکندر سے اول تو اس کا دو سالوں میں سامنا ہی نہ ہونے کے برابر ہوا اور جب ہوا اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا اور وہ بہت کچھ پوچھنے کی چاہ میں ایک لفظ بھی نہ پوچھ سکی تھی اور دو سال مشقت بھری اذیت ناک زندگی

گزارتے گزر گئے تھے اور اس کی نام نہاد شادی کو دوسرا سال تھا جب حویلی میں حمزہ سکندر کی شادی کا شور اٹھا تھا اور اس کی اکلوتی پھپھو کی اکلوتی بیٹی اس کی بیوی بن کر آ گئی تھی، اس نہ خوش فہمی تھی نہ کوئی امید ہی باقی تھی کہ ان لوگوں سے تو کوئی امید باندھی بھی نہ تھی مگر اس کے باوجود بھی حمزہ سکندر کی شادی نے اسے خون کے آنسو رلا دیا تھا اور یوشی کے ساتھ سندس کا بیٹھنا، ہنسنا مسکرانا اس کے دل کی تکلیف بڑھنے لگتی تھی کہ وہ کچھ نہ ہو کر بھی اسے اپنا بہت کچھ لگا کرتا تھا اور یہ اس کے ساتھ ہوئے ظلم کا جواب تھا یا ان کی خوشیوں کو اس کی آہ یا نظر لگی تھی کہ سندس کا نہ صرف مس کیریج ہوا تھا، وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی تھی اور فقط گیارہ ماہ بعد ہی حویلی میں دوبارہ حمزہ سکندر کی شادی کا غلغلہ اٹھا تھا کیونکہ سردار قاسم بیمار تھے اور وہ اپنے پوتے کی اولاد دیکھنا چاہتے تھے، دوسری شادی کی بات چلی تو سندس نے اپنے مفاد کے لئے ایک ایسی بات کی تھی جسے حویلی کے مکین ماننے کو تیار نہ تھے اور حمزہ سکندر تو یوں بھڑکا تھا کہ سندس بھی حیران پریشان رہ گئی تھی کیونکہ اس نے یوشی کا بچپن سے ہی نرم روپ دیکھا تھا اور شادی کے ایک سال بعد ان کی پہلی لڑائی ہوئی تھی جو اتنی بڑھی تھی کہ یوشی نے کبھی جس سے سخت لہجے میں بات نہ کی تھی طمانچہ دے مارا تھا اور دوبارہ وہ بات نہ کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا مگر وہ یوشی کا ردعمل دیکھ کر تو اور بضد ہو گئی تھی اور اس نے نانا سے خود بات کی تھی کہ اس میں اس کا مفاد تھا اسے لگتا تھا کہ جو اوقات شاہ تاج کی اس وقت ہے وہ ساری زندگی رہے گی، یہاں تک کہ حویلی کو وارث دینے کے بعد بھی کہ کوئی اسے قبول کرے گا ہی نہیں، جبکہ کوئی اور لڑکی یوشی کی بیوی بن کر آئے گی تو سندس کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جائے گی، وہ حویلی کو وارث دے کر حویلی والوں کے لئے اہم بن جائے گی اور وہ حویلی کے لئے ناکارہ حیثیت اختیار کر جائے گی اس لئے اس نے خود کو ناکارہ بنانے سے بہتر حمزہ کی پہلی بیوی کو اس کا مقام دلانا چاہا تھا اسی میں اس کو اپنا مفاد نظر آیا تھا، اس نے اور اس کی ماں نے سردار قاسم سے نہ جانے کس طرح اور کیا بات کی تھی کہ وہ ان کے حامی بن گئے تھے اور ان کی راضی ہونے کے بعد کسی کو بھی بولنے کا اختیار نہیں رہا تھا، یہاں تک کہ حمزہ کے تمام اعتراضات تمام نفرت ذہن و دل میں ہی دبی رہ گئی تھی اور وہ ملازماؤں کے کمرے سے اٹھا کر اپنے مفاد کے لئے حمزہ سکندر کی خواب گاہ میں پہنچا دی گئی تھی، حمزہ گھر والوں کے فیصلے سے آگاہ تھا مگر اس نے اسے نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا اور اس کی جتنی تذلیل کر سکتا تھا کی تھی۔

"تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری آزمائش ختم ہو گئی، تم میرے لئے غیر اہم تھیں اور ہمیشہ رہو گی، تمہارے ناپاک وجود سے نہ مجھے کل کوئی دلچسپی تھی نہ آج ہے، نہ آئندہ ہو گی، اپنے سائے کو بھی مجھ سے دور رکھنا سمجھیں اور اس کمرے کی بات اس کمرے سے نکلی تو جان سے مار دوں گا۔" دادا کے سامنے بے بس ہو گیا تھا مگر ساری کمزوری و بے بسی اس کے سامنے ہوا ہو گئی تھی اور وہ جو بھی تھی کہ آزمائش ختم ہوئی نئی آزمائش میں ڈال دی گئی تھی، ان سب کا رویہ بہتر نہ ہوا تھا مگر لالچ کے سبب اس میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور چند ماہ میں ہی اس سے جو سوال کیے جا رہے تھے اس کا جواب اس کے پاس نہ تھا وہ تھی اور اس کی خاموشی بے بسی تھی اور جب اس کی خاموشی ٹوٹی تھی تو وہ حمزہ سکندر کو گونگا بنا گئی تھی۔

حویلی میں خوشگوار ہلچل سی تھی وہ اپنے اور

سندس کے مشترکہ کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس کے اور شاہ تاج کے کمرے سے یوشی کی ماں نکلی تھی اور وہ ماں کی آواز پر رکا تھا اور انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر مبارکباد دے ڈالی تھی، حویلی کی تمام عورتیں مسکرا رہی تھیں اور وہ ساکت کھڑا تھا یوں کہ کاٹو تو بدن میں لہو کی ایک بوند نہیں اس کی وہ حالت تھی اور اس کی حالت سے وہ سب انجان مبارکباد دے رہے تھے، سردار قاسم نے مٹھائی کا ٹکڑا اسکی طرف بڑھایا تھا جسے اس نے کھانے کی بجائے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"دادا سائیں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ سب کو حیران چھوڑ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا، کمرے میں آیا تو وہ بیڈ پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور اسے دیکھ کر جیسے اس کے تن مردہ میں جان پڑ گئی تھی اور وہ تیر کی تیزی سے اس تک پہنچی۔

"حمزہ! سب غلط سمجھ رہے ہیں، آپ جانتے ہیں نہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" بخار چکر، دومیٹنگ سے اس کا برا حال تھا اور حویلی کی کم عمر ملازمہ اس کی واحد خیر خواہ نے اس سب کا دوسرا ہی مطلب اخذ کیا اور حمزہ سکندر کی ماں سے کہہ دیا اور جس پل وہ اس کے کمرے میں آئیں اس کی حالت دیکھ انہوں نے پوری حویلی میں خوشخبری کا شور اٹھا دیا تھا، اپنے اندازے کی ڈاکٹر سے تصدیق تک کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی، جبکہ وہ ہر معاملے کی طرح اس معاملے میں بھی ایک لفظ نہیں بولی تھی کہ اس کی وہاں کوئی سن بھی نہیں رہا تھا، کچھ ہی گھنٹوں میں وہ بہت اہم ہو گئی تھی اس سے مخاطب تک نہ کرنے والی عورتوں نے نظر اور بلائیں اتاری تھیں، خاندانی کپڑے و زیورات دیئے تھے اور وہ ان کے اہمیت دینے پر نہیں اس بات کو لے کر پریشان تھی جو سرے سے نہ تھی مگر کسی کی غلط فہمی دور نہ کر پائی تھی اور یوشی کے آنے کی دعا کرنے لگی تھی تا کہ اصل بات سب کے علم میں آسکے۔

"ہاں میں جانتا ہوں وہ بھی جو تم نے چھپایا اور وہ بھی جو کبھی سامنے نہیں لانا چاہا تھا اور جب سچائی سامنے آگئی تو اپنے گناہ پر، پردہ ڈالنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے، میں تو ہوں ہی ایک بے غیرت شخص ایک بدکردار عورت کو اپنی چھت تلے رکھ سکتا ہوں، پھر اسے کمرے میں رکھ سکتا ہوں، صرف اپنی عزت کے لئے، تماشا نہ بننے کے ڈر سے، تو دنیا کے سامنے اٹھے سر کو اٹھے ہی رہنے دینے کے لئے، صرف عزت بنے رہنے کے لئے تو میں اپنی بیوی کی ناجائز اولاد کو نام بھی دے سکتا ہوں۔" وہ بڑے پرسکون لہجے میں بولا تھا مگر اس کے پیروں تلے سے تو زمین ہی سرک گئی تھی۔

"یہ......یہ......آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" گہری کھائی سے گویا اس کی آواز نکلی تھی اور اس نے چھت پھاڑ قہقہہ لگایا تھا۔

"اس سادگی پر کون نہ مر جائے لیکن اپنے ڈھونگ اپنے پاس رکھو، جب سے تم اپنا ناپاک وجود میرے گھر میں لے کر آئی ہو میں صرف اپنی اور خاندان کی عزت کی خاطر چپ رہا، آگے بھی تماشائی بنے رہنے کو تیار ہوں، تمہارے داغ اپنی عزت کی چادر میں ڈھانپنے کو تیار ہوں تو فضول کا ڈرامہ چہ معنی دارد۔" وہ اب بھی ٹھنڈے بے لچک لہجے میں بولا تھا اور بیڈ کی طرف بڑھا تھا کہ وہ اس کا بازو تھام گئی تھی اور وہ اس کی اتنی جرأت پر اسے دیکھنے لگا اور بھڑک کر کچھ کہتا کہ وہ بول پڑی۔

"آپ کیا بول رہے ہیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، میں نے کسی سے کچھ نہیں چھپایا

ہے، نہ میں نے ایسے کوئی گناہ کیے ہیں جنہیں چھپانے کی نوبت آتی، آپ کے گھر والوں کو تو خیر غلط فہمی ہوئی ہے آپ اسے سچ مانتے ہیں تو بے شک جو ٹیسٹ کروانا چاہیں کرالیں اور یہ یاد رکھیں، قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی بہت سن لیا، مگر اب مزید نہیں سنوں گی۔" وہ خود ہی اپنا ہاتھ کھینچتی چٹانوں سے سخت لہجے میں بولی تھی۔

"بدکردار کو بدکردار نہ کہوں تو پھر کیا کہوں پارسا، باکردار عورت۔" وہ کل رات سے اس کی باتوں میں الجھا ہوا تھا اور وہ الجھن و شر ساری گھر آتے ہی مٹ گئی تھی، وہ اس کی بات پر چونکا ضرور مگر اس پر تو شک کا بھوت سوار تھا، سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور گہرے طنز سے بول گیا۔

"میں بدکردار ہوں تو لایئے میری بدکرداری کا کوئی ثبوت، کہ مجھ پر تو پچھلے تین سالوں میں آپ نے بھروسہ نہیں کیا آج کیا کریں گے اور آپ کو لگتا ہے کہ میں پریگنٹ ہوں تو چیک کرلیں ڈاکٹر ہیں نہ آپ، ورنہ ڈاکٹروں کی دنیا میں کمی بھی نہیں ہے، الزام نہ لگائیں مجھ پر کہ ساری تکلیفیں برداشت کرسکتی تھی، بدکردار ہونے کا لیبل برداشت نہیں کرسکتی اور آپ مجھ پر بدکرداری کا لیبل لگا کر رہے ہیں۔"

"ہاں تو وہ ملک صمد تمہارا کیا لگتا ہے۔"

"ملک صمد۔" وہ زیرلب نام دہرا کر الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں ملک صمد جس کے ساتھ تم نے اچھا بڑا وقت گزارا، تمہارا ناپاک وجود خون بہا میں میرے نام کردیا گیا، جبکہ میں تم جیسی عورت کے ساتھ رہنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہوں، مگر توہین برداشت کی کس سے کہتا کہ خون بہا میں جو عورت مجھے ملی ہے وہ ایک برتی ہوئی عورت ہے۔"

"چٹاخ! میں خاموش ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کا جو دل چاہے گا وہ مجھے کہیں گے، میں ملک صمد سے بات کرنا گوارا نہیں کرتی تھی اس کے ساتھ وقت گزاروں گی، لعنت ہے مجھ پر اور آپ کی اس سوچ پر۔" وہ غصہ کی لپیٹ میں بہت بڑا قدم اٹھا گئی تھی۔

"ذلیل عورت اب اپنا جرم، اپنا گناہ چھپانے کو تم مجھے جھوٹا کہو گی۔" اس کا منہ حمزہ سکندر نے تھپڑوں سے سرخ کر ڈالا تھا۔

"ہاں ہیں آپ جھوٹے، مجھ پر بہتان باندھ رہے ہیں، ہیں سچے تو لایئے میرے گناہ کا ثبوت۔" وہ کسی بھی بات کی پرواہ کیے بغیر غم و غصہ سے چیخی تھی۔

"ثبوت کی بات کرتی ہو، جس کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی ہو اس نے خود مجھ سے کہا تھا کہ تم اس کی......" وہ لفظ ادا نہیں کرسکا تھا اور اس کی گردن اپنی گرفت سے آزاد کردی تھی۔

"وہ جھوٹ بولتے ہیں، انہوں نے آپ سے جھوٹ کہا تھا میں ایسی نہیں ہوں، میں جب سے میں حویلی آئی تھی وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے، اس شام جب میں آپ سے بات کررہی تھی وہ آپ کے سامنے کتنی بدتمیزی سے مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے، انہوں نے بابا سے کہا تھا کہ میرا آپ سے افیئر چل رہا ہے، تب ان کی بہتان باندھتی زبان کو لگام ڈالنے کے لئے میں نے انہیں تھپڑ مارا تھا، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے میرا سارا غرور چھین کر ہی دم لیں گے اور اس کے اگلے دن ہی میرا آپ سے آنا فانا نکاح ہوگیا، انہوں نے آپ سے کیا کہا میں نہیں جانتی اور نہ ہی میرے پاس اپنی باکرداری کا ثبوت ہے، میں جانتی ہوں اور میرا اللہ، میں آپ کو یقین نہیں دلاسکتی کہ میں ناپاک گناہگار وجود کے

ساتھ آپ کے نکاح میں نہیں بندھی، میرا ملک صمد سے کوئی تعلق نہیں ہے، میری گواہی صرف میرے اللہ کے پاس ہے اور میں اپنے اللہ اور رسول کی اس پاک کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتی ہوں کہ میں بدکردار نہیں ہوں، ملک صمد سے میرا کوئی اچھا برا تعلق نہیں ہے۔" اس نے حمزہ سکندر کو کچھ کہنے کرنے کا مزید موقع دیا ہی نہیں، روتے ہوئے اپنی صفائی میں جتنا کہہ سکتی تھی کہا تھا، سچائی اس کے لفظوں میں ہی نہیں اس کی شفاف آنکھوں سے بھی بیان ہو رہی تھی اور بہ حیثیت مسلمان اس کا اٹھایا ہوا قدم حمزہ سکندر کو ساکت کر گیا تھا اور وہ اب اسے دیکھ رہا تھا جس نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر اپنے سچے و بے گناہ ہونے کا یقین دلانا چاہا تھا، قرآن پاک سینے سے لگائے سسک رہی تھی۔

"میں گناہ گار، بدکردار سب کچھ ہو سکتی ہوں اللہ کی اس پاک کتاب کو گواہ بنا کر نہ جھوٹ بول سکتی ہوں نہ میں نے بولا ہے، آپ مجھ پر یقین نہیں کر سکتے حمزہ سکندر مگر اس کتاب پر تو یقین رکھ سکتے ہیں تو میرا بھی یقین کر لیں کہ اس پاک کتاب کو گواہ بنا کر آپ سے میں نے جھوٹ نہیں بولا، اللہ اور اس کے رسول کی گواہی جھوٹی نہیں ہو سکتی۔" کمرے میں اب صرف اس کی ہچکیاں و سسکیاں ہی گونج رہی تھیں وہ کافی دیر شرمندہ سا کھڑا رہا، پیشانی سے عرق ندامت پونچھتا، اس تک پہنچا، اس کے ہاتھ سے قرآن پاک لے کر چوم کر اس کی جگہ پر حفاظت سے رکھ دیا اور گھٹنوں کے بل وہیں زمین پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"تین سال کسی کو نفرت سے دھتکارنے اور اس پر انگلی اٹھانے کے لئے کم نہیں ہوتے، میں تمہیں نہیں جانتا تھا مگر میں نے تمہیں وہ سمجھ لیا جو ملک صمد نے مجھے بتایا، ملک صمد نے پنچائیت کے فیصلے اور نکاح کے بعد مجھ سے کہا کہ تمہارے اور اس کے غلط قسم کے تعلقات ہیں، میں نے یقین کر لیا، تمہیں چھوڑ نہیں سکتا تھا نہ یہ بات زبان سے نکال سکتا تھا، ہاں تم سے تصدیق کر سکتا تھا، مگر میں نے نہیں کی، اس کے باندھے بہتان کی روشنی میں تم سے نفرت کی، تم سے بے انتہا نفرت کی، تمہیں غلط و بدکردار سمجھ کر تمہیں تذلیل کے قابل جانا اور صبح و شام تمہاری تذلیل کی، تین سال سے تمہیں غلط سمجھ کر تمہارے خلاف ذہن و دل میں عداوت رکھی، اس حویلی میں ہونے والے ظلم کو بھی درست جانا کہ مجھے لگتا تھا کہ تم اس سے زیادہ کی سزاوار ہو، میں تو وہ شخص تھا جس نے ہمیشہ انصاف کی بات کی تھی مگر تمہیں انصاف نہ دلا سکا، تم اس حویلی کی بہو تھیں، میں نے نوکرانی بن جانے دیا، میں سوچتا تھا کہ اس زندگی پر بھی تمہاری جیسے گناہگار عورت کا حق نہیں ہے تمہارا قتل تو واجب ہو چکا ہے، اس لئے اس طرح زندگی گزارنا ہی تمہاری سزا ہے، وگرنہ یہ میں ہی تو تھا جس نے ادا اجمل کی بیوی کو حویلی میں ان کا حق و مقام دلایا تھا جبکہ ادا اجمل کی بیوی بھی خون بہا میں ہی آئی تھی، مگر میں اس عورت کے حق کے لئے لڑا تھا، کامیاب بھی ہو گیا تھا، مگر بھرجائی کی زندگی نے ہی وفا نہ کی، اور میں لیکن تمہارے اپنی بیوی کے حق کے لئے آواز اٹھانا ہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ میری نگاہ میں میری بیوی بدکردار تھی اور جب دادا سائیں کے فیصلے پر تم میرے کمرے میں پہنچائی گئی تھیں اس شب سے آج کچھ گھنٹوں قبل تک کی اذیت لفظوں میں بیان کرنے لگوں تو جس کرب میں میں گزرتا رہا ہوں، میں نہیں کہتا بہت متقی پرہیز گار، برائیوں سے مبرا، نیکی کا پتلا ہے، ہاں حمزہ سکندر سب کچھ ہو سکتا ہے بدکردار نہیں ہے، بے حیا نہیں ہے، حیا ایمان کا حصہ ہے

اور ایمان کی سلامتی کے لئے حمزہ سکندر نے حیا کو ہمیشہ سلامت رکھنے کی کوشش کی اور اللہ نے مجھے کامیاب بھی کیا اور میری آزمائش مجھے بھٹکا کر نہیں کی گئی، بلکہ میری بیوی کو بھٹکا ہوا پیش کر کے کی اور میں نہ جانے کس لمحے سے حیا کے راستے پر چلتے چلتے اس پر چلتے رہنے پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے زعم میں مبتلا ہو گیا اور وہی زعم مجھے لے ڈوبا، مجھے اپنے باحیا ہونے پر فخر تھا مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی، اچھائی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ میں لوگوں کو برائی سے روکنے کی کوشش کرتا بلکہ میں تو بے حیاؤں کے خلاف عناد پال کر بیٹھ گیا، جبکہ نفرت گناہ کے مرتکبین سے نہیں گناہ سے کی جاتی ہے، جبکہ میں نے برے کو اس کی برائی بتانے اور روکنے کی کوشش بھی نہ کی، میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے راستے پر تو کبھی چلا ہی نہیں اور میں سزا دینے والا کون ہوتا تھا؟ تم بدکردار تھیں بھی تو اللہ کی گناہگار تھی نہ میں کیوں تمہیں سزا دیتا رہا؟ اور میں کیسے خود ہی سارے فیصلے کرتا گیا؟ مجرم تھیں تم تو خدانخواستہ تمہیں ایک بار تو صفائی کا موقع دینا چاہیے تھا، لیکن میں نے نہیں دیا، کسی پر بہتان باندھنا کتنا سخت گناہ ہے اور میں سمجھتا رہا کہ میں نیکی کے راستے پر چل رہا ہوں مگر نہیں ایک پاکباز عورت پر بہتان باندھ کر میں گناہگاروں کی صف میں شامل ہو گیا، کوئی مجھے جھوٹا کہے تو مجھے برداشت نہیں ہوتا اور میں تمہیں چیخ چیخ کر بدکردار کہتا رہا کس بنیاد پر؟ ثبوت کیا تھا میرے پاس؟ کچھ بھی نہیں، میں نے تم پر ہی نہیں خود پر بھی ظلم کیا ہے، تمہیں وہ سمجھا جو تم نہیں تھیں، میں نے تمہیں شک کی نگاہ سے دیکھا تمہیں بدکردار سمجھا اور کہا، میں معافی کے لائق نہیں ہوں، شاہ تاج لیکن مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو شاہ تاج مجھے معاف کر دو۔" وہ

پھوٹ پھوٹ کر روتا اس کے سامنے دوزانوں بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں برا کہتا سمجھتا رہا، اللہ سے شکوے کرتا رہا کہ میرا نکاح ایسی لڑکی سے کیوں ہوا جو میرے لائق نہ تھی، میں اپنی اچھائی کے زعم میں رہا کاش کہ میں آنکھیں اور ذہن و دل کھول کر ہر چیز و بات کا معائنہ کرتا تو حقیقت مجھ پر کھل جاتی تین سال صرف تم نہیں لیکن میں بھی اذیت میں رہا ہوں تم اپنے بے قصور ہونے کی سزا جھیل رہی تھیں اور میں تمہیں سزا دینے کی چاہ میں خود کو سزا دیتا رہا، کاش کہ میں سچائی جاننے کی کوشش کرتا۔"

"سچائی جاننے کی آپ کوشش جب کرتے جب آپ کو یقین ہوتا کہ وہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔" اس کے رونے میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"ہاں مجھے ملک صمد کے کہے پر یقین تھا، تمہارے روز و شب نے بھی جس پر دراڑ نہیں ڈالی، میری آنکھوں پر شک کی پٹی بندھ گئی تھی، میں نے تمہارے ساتھ......"

"آپ نے میرے ساتھ بہت غلط کیا ہے، میری ذات میرے پندار، میری نسوانیت کے غرور کے تنکے سے بھی ہلکا کر دیا ہے، تین سال میں نے جس اذیت میں گزارے ہیں میں جانتی ہوں یا میرا اللہ اور میں ان تین سالوں کی اذیت بھلا سکتی ہوں، مگر وہ ایک لمحہ کبھی مجھے نہیں بھول سکتا جب آپ نے مجھے بدکردار سمجھا، کہا نہیں تھا نہ لیکن آپ کے رویے سے میں نے اپنے لئے نفرت سے زیادہ حقارت محسوس کی تھی اور وہ حقارت مجھے نہیں بھول سکتی، معاف کرنے کا اختیار اس کے پاس ہوتا ہے جو با اختیار ہو، مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، ماں نے بڑی حفاظت سے پالا، میرا باپ مجھے میری ماں سے

چھیننے میں کامیاب ہو گیا کہ میری ماں کمزور تھی، اور باپ با اختیار اور میرے باپ نے بیٹے کی زندگی، نسل کی بقاء کے لئے مجھے ناکارہ سامان کی طرح رخصت کر دیا، میں کمزور تھی حق تک کا استعمال نہ کر سکی اور لب سیے بابل کی دہلیز پار کر لی، سسرال میں نوکرانی بنا دی گئی کہ قاتل کی بہن کو اتنی تو سزا ملنی ہی چاہیے کہ وہ اپنے جائز حقوق اور عزت و مان سے بھی محروم رہے، میں نہ بھی کمزور تھی نہ اس لئے محرومی میں تین سال بسر کیے، مگر با اختیار لوگوں نے نسل کی بقاء کے لئے خیرات میں مجھے میرے جائز حق دینا چاہے، مگر میرا شوہر انکاری ہو گیا کہ اس کی نظر میں، میں بدکردار تھی اور وہ ایک بدکردار عورت کو اپنی نسلوں کی آبیاری نہیں سونپ سکتا تھا، مگر وہ با اختیار شخص یہاں مجبور تھا کہ وہ بیوی کی بدکرداری کی داستان لب سے کہہ نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے اپنی نام نہاد عزت سکون سے زیادہ عزیز تھی، بے سکون رہا، اذیت میں رہا مگر بیوی کو آزاد نہیں کر سکا اور میں تو ہوں ہی ازل سے کمزور، نہ رشتے میں مرضی سے بندھی نہ الگ ہو سکتی ہوں، کہ جیسے آپ کسی کے سامنے یہ نہیں کہہ سکے تھے کہ آپ کی بیوی بدکردار ہے، میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میرا شوہر مجھے بدکردار سمجھتا ہے اسے میری پاکیزگی پر شک ہے، ہم سب اپنے طور پر مجبور ہیں، کمزور و بے بس ہیں، معاف کرنے کا اختیار تو جب ہوتا میرے پاس جب مجھے دوسرا راستہ نظر آ رہا ہوتا، معاف کروں تو یہیں رہوں گی، نہ کروں تو یہیں رہوں گی، اس لئے معافی رہنے دیں اور مجھے کچھ وقت دے دیں تا کہ نئی اذیتوں کو جھیل لوں، فراموش نہ کر سکوں، بھولنے کی کوشش ہی کر دیکھوں، کہ کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں ہے، نہ معاف کرنا نہ بھولنا، ہاں کوشش کر سکتی ہوں اور

جس دن اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئی، آپ کو معافی خود بخود مل جائے گی، مگر کچھ تو انتظار کرنا ہوگا کہ تین سالوں کی اذیت تین لمحوں میں مٹ نہیں سکتی۔" اس نے آنسو رگڑے تھے اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تین لمحے نہیں میں تین صدیاں انتظار کر سکتا ہوں کہ غلطی بہرحال مجھ سے ہوئی ہے، تم سزا دینے میں حق بجانب ہو اور میں انتظار کے ریپر میں لپٹی سزا کو قبول کرتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ سزا کی مدت پوری کر سکوں جب تک تم چاہو اور میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر تمہارے یہ دکھ اور اذیت کے مداوے کی تمہارے کھوئے ہوئے مان اور عزت اور مقام کو تمہیں لوٹانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا کہ سزا صرف تم نے نہیں میں نے خود اپنے لئے منتخب کی ہے کہ میں تمہاری آنکھوں سے گر کر زندہ رہ سکتا ہوں مگر اپنی آنکھوں سے گر کر نہیں اور آج میں اپنی ہی نگاہوں سے گر گیا ہوں اور تب ہی اٹھ سکوں گا جب تمہیں تمہارے مقام و حیثیت کے مطابق دنیا کی نظروں میں اپنی اور تمہاری نظروں میں اٹھا دوں گا۔" وہ آنسو پونچھتا کھڑا ہوا تھا اور ایک نئے عزم سے بولا تھا، اس نے حمزہ سکندر کی طرف دیکھا۔

"وہ مقام جو آپ اب مجھے دلانا چاہتے ہیں اس کی چاہ نہیں ہے مجھے کہ کنول کیچڑ میں کھل کر بھی کنول ہی رہتا ہے، سلوک میرے ساتھ جو بھی ہو، سمجھا کچھ بھی جائے مگر میرا مقام اس حویلی میں بہو اور بیوی کا ہی رہے گا، جیسے کیچڑ بھی کنول پر اثر انداز نہیں ہوتا، میری حیثیت کسی کی سوچ اور رویے سے متاثر نہیں ہوتی کہ نوکرانیوں جیسی زندگی گزارنے کے بعد بھی میں اس حویلی کی بہو ہی کہلاتی ہوں، ہاں مجھے اس بات سے فرق پڑتا ہے کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں کہ آپ کے بدکردار سوچنے سے میں بدکردار ہوئی نہیں مگر یہ الزام برداشت بھی نہیں ہوتا کیونکہ جسم کی تکلیف تو برداشت ہو جاتی ہے لیکن روح کی تکلیف نہیں ہوتی، آپ کی آنکھوں میں آپ کے رویے میں مجھے جس دن بے اختیار سی بااعتباری نظر آ گئی تو میں سمجھوں گی کہ کنول کھل گیا ہے، وگرنہ سمجھوں گی کیچڑ میں کھلنے والا کنول اپنی الگ پہچان رکھتے ہوئے بدنصیبی کا شکار ہو کر کھلنے کی بجائے مرجھا گیا ہے اور یہ اب آپ پر منحصر ہے کہ کنول کو اس کی پہچان ہی رہنے دیتے ہیں یا نہیں۔" وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے خود اعتمادی سے بولی تھی۔

"ہاں ٹھیک کہا، مگر کنول مرجھا کر بھی کنول رہتا ہے جیسے تم میری سوچوں کے برعکس جو تھیں وہی رہیں اور میں انشاء اللہ اس کنول کو مرجھانے نہ دوں گا اور یہ اپنی انفرادیت کے ساتھ ضرور کھل کر رہے گا اور یہ دعویٰ نہیں یہ وقت ثابت کرے گا کیونکہ تمہاری زندگی کی رات ختم ہوگئی ہے شاہ تاج اور روشن سویرا بانہیں پھیلائے تمہیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔" اس نے اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا تھا جہاں سادگی اور بھولپن، پاکیزگی اور نور رچا تھا جسے وہ دیکھ نہیں سکا تھا کہ بعض دفعہ سامنے کی نمایاں چیزوں کے لئے بھی مائیکرو اسکوپ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا مگر وہ مسکرا نہیں سکی کہ ابھی اس کا اعتبار لوٹا نہیں ہے، مگر وہ وقت دور نہیں ہے جب اس کا اعتبار لوٹے گا اور اس کا انتظار ختم ہوگا اور زندگی بہاراں بن جائے گی کہ خزاں کے بعد بہار کو آنا ہی ہے۔

☆☆☆